امام اہلِ سنت، حنفی فقہ کے بانی
امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
کی سیرت، حیات اور اُن کی فقہی زندگی اور کام کے بارے میں
ایک مختصر جائزہ

امامِ اعظم ابو حنیفہ
حیات و فقہی کارنامے

تلخیص و تالیف
مُشتاق احمد قریشی

اسلامی کُتب خانہ

امام اہل سنت

حنفی فقہ کے بانی: امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کی سیرت، حیات اور ان کی فقہی زندگی اور کام کے بارے میں ایک مختصر جائزہ

امام اعظم ابوحنیفہؒ

حیات وفقہی کارنامے

تلخیص وتالیف

مشتاق احمد قریشی

111749

نام کتاب ——— امام اعظم ابوحنیفہ حیات وفقہی کارنامے

تالیف ——— مشتاق احمد قریشی صاحب

کمپوزنگ ——— طاہر احمد قریشی صاحب

ناشر ——— اسلامی کتب خانہ

طابع ——— ممتاز احمد

پرنٹر ——— ریاض شہباز پرنٹر

نئے افق گروپ آف پبلی کیشن۔ احمد چیمبر بالمو ریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

صحت متن، کتابت، تصحیح، طباعت اور جلد بندی میں انتہائی احتیاط کے باوجود بہ تقاضائے بشریت سہو کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ غلطی کی نشاندہی پر ادارہ مشکور ہوگا۔

جزاک اللہ خیراً ——— اراکین ادارہ

انتساب

اپنے بیٹے عمران احمد قریشی کے نام
جس کے تجسس اور فرمائش نے یہ تالیف تحریر کرائی۔
اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازے اور صراط مستقیم پر چلنے والا بنائے
آمین۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(حضرت مولانا) ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر
مدیر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

جناب مشتاق احمد قریشی صاحب منجھے ہوئے قلم کار اور پرانے انشاٗ پرداز ہیں، کبھی وہ ڈائجسٹوں میں لکھا کرتے تھے تو کبھی اخبارات میں۔ لیکن جب رحمت الٰہی ان کی طرف متوجہ ہوئی تو ان کے قلم کا رُخ بدل گیا اور انہوں نے اسلامی موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا، ان کی کئی ایک کتب منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں موصوف نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی حیات وخدماتؒ کا سہل اور عام فہم انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

کتاب پر ہمارے رفیق مولانا سعید احمد جلال پوری مدیر ماہنامہ بینات کی تقریظ ہے، میں بھی ان پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تائید وتحسین کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ مرتب کی اس سعی وکوشش کو قبول فرما کر ذریعہ نجات آخرت بنائے۔ آمین

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

(مولانا) سعید احمد جلال پوری
(مدیر ماہنامہ بینات کراچی)

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

امام الآئمہ حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ کی شخصیت' حیات و کردار' علم و عمل' فہم و ذکا' زہد و تکشف' اطاعت و عبادت' بحث و تحقیق' اخذ و اجتہاد' جہد و مجاہدہ' حلم و تحمل' سکون و وقار' ورع و تقویٰ' احتیاط و اجتناب' حق گوئی و بے باکی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو حضرت امامؒ کی سیرت و کردار پر احناف سے زیادہ دوسروں نے لکھا اور لکھنے کا حق ادا کر دیا۔

حضرت الامام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی غیر معمولی صفات و کمالات کی بناء پر ایسی محبوبیت و مقبولیت سے نوازا کہ ہر دور کے اکابر و اساطین نے ان کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ لکھ کر اپنے آپ کو خریداران یوسف میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسے بدنصیب بھی رہے' جنہوں نے حضرت امامؒ کی شان میں گستاخی کر کے اپنی سیاہ بختی اور حضرت الامامؒ کی بلندیٔ درجات کا سامان کیا۔ پیش نظر کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی

نے جو ہے مخدوم جناب مشتاق احمد قریشی کا اثر خامہ ہے' اللہ تعالی جزائے خیر دے قریشی صاحب کو جنہوں نے اپنے قلم کی عنان احقاق حق کی طرف موڑ دی' جبکہ بہت سے لکھاری نعوذ باللہ! اللہ کی اس نعمت کو کفر و طغیان میں استعمال کر کے نار و سقر میں ٹھکانا بناتے ہیں۔

چونکہ قریشی صاحب نے پیش نظر کتاب میں اس موضوع پر لکھی گئی اردو کتب سے استفادہ کیا ہے' اس لئے راقم الحروف کے رفیق مولانا محمد اعجاز صاحب نے اس کتاب کو از اول تا آخر پڑھا ہے تاہم کچھ حصہ مکمل اور کچھ کے ان مقامات کو دیکھا جہاں رفیق محترم نے نشاندہی کی تھی۔ اس لئے ایسی باتیں جو تاریخی حقائق سے متصادم تھیں' ان کو قلم زد کر دیا ہے' اس اعتبار سے یہ کتاب جیسا کہ مؤلف موصوف نے پیش لفظ میں لکھا ہے' ایسے قارئین کے لئے' جو اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں مگر حضرت امام ابو حنیفہ کے تعارف سے ناآشنا ہیں' راہ نما ثابت ہوگی اللہ تعالی مرتب موصوف اور ناشرین کی اس پر خلوص سعی و کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حافظ عبدالقیوم نعمانی
رئیس جامعہ مصباح العلوم محمودیہ
خطیب جامع مسجد مریم
مفتی محمود اسٹریٹ منظور کالونی' کراچی۔

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلام علی خاتم الانبیاءؐ ولی الہ الاصفیاؓ واصحابہ الاتقیاء۔

امابعد! ابن آدم بحیثیت انسان اس کا مکلّف ہے کہ اپنے رحمان و مہربان رب تعالیٰ کا شکر بجالاتا رہے اور بے قراری و ناشکری سے اجتناب کرے۔ اگر کسی بھی فرد امت نے اس گر کو اپنالیا تو یقیناً وہ اصلاح و فلاح اور کامیابی کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ اب پوری زندگی اطاعت و شکر میں بسر ہوگی اور آخرت میں راحت و انعام پائے گا۔ اس لئے کہ تمام فرمودات و عبادات سے مقصود شکر منعم ہی ہے۔ پھر بدنی' مالی' علمی' عملی' اجتماعی' انفرادی' دینی' ملی...... تمام نعمتوں کے شکر کی صورتیں متعدد اور مختلف ہے۔ کسی کا شکر جبیں جھکانے اور زمین پر لٹکانے میں ہے۔ کسی کا شکر راہ خدا میں مال نچھاور کرنے اور لٹانے میں ہے۔ کسی کا شکر معاد لباس اتارنے' وطن چھوڑنے اور گرد کعبہ چکر لگانے میں ہے۔ کسی کا شکر گردن کٹانے اور درجہ شہادت پانے میں ہے۔ کسی کا شکر اجتہاد و استنباط اور امت کو راہ ھدیٰ پر لانے میں ہے اور علمی نعمت و استعداد کا شکر قلم اٹھانے میں ہے۔ چنانچہ ہمارے دیرینہ مخلص دوست جناب الحاج مشتاق احمد قریشی زید مجدہ نے خداداد صلاحیتوں اور عنایتوں کے اظہار اور شکر و اقرار کے لئے قلم اٹھایا اور لکھتے ہی گئے۔ ممدوح کے قلم سے عوام و خواص سب مستفید و محظوظ ہوتے ہیں اور ہوتے

رہیں گے۔ موصوف نے روزنامہ جنگ میں بے شمار کالم لکھے جن میں حق اور حقیقت کو آشکار کیا۔ قارئین خوب مستفید ہوئے۔ تادم تحریر یہ سلسلہ جاری ہے۔ صحافت و کالم نگاری کے ساتھ ساتھ قریشی صاحب' تالیفی میدان میں بھی خاص دسترس رکھتے ہیں اور اس سے قبل ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''امام اعظم ابوحنیفہؒ کی حیات و فقہی کارنامے'' اسی تسلسل کی کڑی کا ایک انمول سا موتی ہے جو کرۂ ارض پر کثیر التقلید' معتمد امت' رہنمائے ملت' امام ابوحنیفہؒ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ کی جانکارو پرہیزگار اور مقتدیٰ شخصیت اور ان کی خدمات کو اُجاگر کرنے کے لئے منصۂ شہود پر لائی گئی ہے۔

محترم مؤلف نے امام اعظم کی شخصیت' تقویٰ' اجتہاد و استنباط' اہل سنت' تقلید' فقہ' اسلامی فقہ کی تاریخ و ادوار جیسے عنوانات اور دیگر متعدد موضوعات پر مفصل' عام فہم' دلچسپ اور مقبول عندالکل مباحث رقم کی ہیں اور بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتاب امام اعظمؒ کے مقلدین کے لئے مفید اور شش و پنج میں پڑے لوگوں کے لئے راہ حق کی نوید' سرخروئی کی کلید اور اعتدال کی تائید ہے جواب بھی نہ سدھرے وہ ''ظلام للعبید'' ہے۔ راقم الحروف نے اپنی بے علمی کے اقرار اور کم مائیگی کے اظہار کے ساتھ محترم مؤلف کے اصرار پر یہ کلمات لکھ دیئے ہیں۔ ورنہ من دانم کہ من آنم

اللہ تعالیٰ ہماری سیئات کو معاف فرمائے۔ حسنات کو قبول فرمائے۔ شفاعت نصیب فرمائے اور مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کی علمی خدمات کو قبول فرما کر مزید ترقیاں نصیب فرمائے۔ ان کی تالیف کو قبولیت عامہ و تامہ نصیب فرمائے اور قریشی صاحب کی مغفرت و رفعت کا باعث بنائے۔ آمین آمین یارب العالمین۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

فضل خالق

فاضل جامعہ علوم اسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن وخطیب مسجد ابراہیمی
بلاک A نارتھ ناظم آباد کراچی۔

دین اسلام ایک ابدی دین ہے۔اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ پاک نے خود لیا ہے۔دشمنان دین اسلام کتنی ہی کوششیں اس دین کو ختم کرنے کی کریں وہ اپنے ناپاک عزائم میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ پاک نے اس دین کی حفاظت اپنے بندوں میں سے ایک برگزیدہ ہستیوں کے ذریعے سے کروائی ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس دین کی بقا و اشاعت وحفاظت کے لئے وقف کی ہیں۔انہی عظیم ہستیوں میں ایک بہت بڑی شخصیت اور ہستی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی ہے جو بقول علماء کی ایک جماعت کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''اگر دین ثریا ستارے پر بھی پہنچ جائے (تو حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) تو ان کی قوم کے کچھ لوگ اس کو وہاں سے بھی حاصل کرلیں گے'' کے مصداق ہیں۔حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ آج بے شمار کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی جاچکی ہیں اور مسلسل لکھی جارہی ہیں لیکن

تشنگی ختم نہیں ہو رہی ہے۔ بقول حضرت امام شافعی کہ

اعدد ذکر نعمان لنا۔ ان ذکرہ هو المسنک ماکررته ینظوع۔

ہمارے سامنے نعمان کا ذکر بار بار کرو بے شک ان کا تذکرہ مشک کے مانند ہے جتنا ہلاؤ

گے اتنا ہی خوشبو پھیلے گی۔

حال ہی میں جناب الحاج مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو علماء اور بزرگان دین کے

نہایت عقیدتمندوں اور عشاق میں سے ہیں اور کئی آیات کی تفسیر کی کتابوں کے مصنف ہیں۔

جنگ اخبار کے معروف کالم نگار ہیں۔ غرض قریشی صاحب کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔

اللہ پاک انہیں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ کی سیرت پر کتاب

لکھ کر نہ صرف یہ کہ امام ابوحنیفہ کی سیرت کو ہر پہلو سے اجاگر کیا ہے بلکہ فقہ حنفی پر سیر حاصل

بحث کی ہے۔ دیگر فقہی مسالک پر بھی اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت

ساری معلومات ہیں۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ امید ہے قارئین کرام اپنے حق

میں اس کو بہت مفید پائیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اس کتاب کو شرف قبولیت عطا فرما

کر اس کو مفید عام بنادے۔ آمین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مولانا مفتی عبد الجلیل
استاد جامعہ مصباح العلوم محمودیہ
منظور کالونی کراچی۔

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد بندہ نے اپنی بساط کے مطابق محترم الحاج مشتاق احمد قریشی صاحب کے قلمی شاہکار بعنوان ''امام اعظم ابوحنیفہؒ کی حیات و فقہی کارنامے'' حسب حکم مربی و محسن پیر طریقت جناب حضرت حافظ عبدالقیوم نعمانی صاحب دامت برکاتہ اول تا آخر بہ نظر عمیق مطالعہ کیا۔
لفظی کتابت میں بعض مقامات پر کمی بیشی محسوس کی ہے جن کی نشاندہی کردی گئی ہے۔
مزید برآں صفحہ نمبر 204 پر مکتوب آیت ''واذا حضر القسمہ...... 41'' کے ذیل میں جو فقہی مسئلہ کی تشریح کی گئی ہے ابہام کی وجہ سے عام قاری کے لئے ناکافی ہے۔ مذکورہ تشریح سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مشترکہ مال وراثت کی تقسیم کے وقت ان غریب، مسکین، یتیم، ضرورت مند رشتہ داروں کو بھی اس مال وراثت میں سے کچھ نہ کچھ دے دیا جائے۔ اگرچہ مال متروکہ میں وہ کسی قسم کا حصہ نہ پاتے ہوں۔ لیکن موقع تقسیم پر وہ حاضر ہوں جبکہ مسئلہ کی رو سے یہ تفہیم غلط ہے بلکہ صحیح تشریح یوں مناسب ہے جیسا کہ معارف القرآن میں ہے۔
موجودہ ورثاء (حصہ پانے والے) تقسیم کے بعد اپنے حصص میں سے بطور احسان ان ناداروں کو کچھ نہ کچھ دے دیں۔ غائب اور نابالغ وارث کے حصہ کو کاٹ کر دینا شرعاً بالکل ناجائز ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن۔
باقی جہاں تک کتاب ہذا کی افادیت کا تعلق ہے۔ امام صاحبؒ کے نام اور تاریخ ساز

بصیرت وشخصیت سے واضح ہے جو شخص جس قدر باصلاحیت اور باکمال ہوتا ہے اسی درجہ اس کی مدح سرائی بھی ہوتی ہے اور عداوت وتنقید کا شکار بھی۔ یہی کچھ امام صاحبؒ کے ساتھ بھی ہوا جہاں اعلام امت کے ایک بڑے طبقے نے امام صاحبؒ کی عہد ساز شخصیت اور فقہی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور ان کی بلند پایہ علمی شخصیت کو ہر پہلو سے خراج عقیدت پیش کیا تو دوسری طرف بغض وحسد رکھنے والے ناقدین کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ جو امام صاحب کی معصومانہ زندگی پر قدغن و بے بنیاد الزامات لگانے سے بھی باز نہ رہے اور آپ کی شخصیت کو ہر طرح سے مجروح کرنے کی ناکام کوشش ہوتی رہی۔ مگر یہ بھی قدرت کی عجیب و غریب کرشمہ سازی ہے کہ مخالفین نے جتنا بھی آپ کو بدنام کرنا چاہا اتنا ہی آپ کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا رہا اور جتنا کوتاہ قامت دکھانے کی کوشش کی گئی اتنے ہی بلند قامت ہوتے گئے۔

مخالفین کی ان بہتان طرازیوں کا مدلل اور مکمل دفاع نہ صرف یہ کہ امام صاحبؒ کے مسلکی پیروکار علماء احنافؒ نے کیا بلکہ مذاہب اربع سے وابستگی رکھنے والے مایہ ناز علماء کرام اور حضرات محدثین نے بھی بھرپور دفاع کیا۔

اور امام صاحبؒ کی بے مثال شخصیت اور قابل رشک عظمتوں کے نقوش کو جن لوگوں نے خوب سے خوب تر اجاگر کیا۔ انہی میں ایک روزنامہ جنگ کراچی معروف کالم نگار اور بہت اچھے صحافی، علماء حضرات کرام کے خادم جناب الحاج مشتاق احمد قریشی صاحب ہیں جن کے مقدر میں اس کار خیر کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر دیا۔

موصوف نے کتاب ہذا لکھ کر صحافت کے میدان میں ایک سنہری باب رقم کیا ہے اور عوام الناس پر احسان کرتے ہوئے ایک گراں قدر تحفہ فراہم کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مؤلف کے لئے اس کار خیر کو صدقہ جاریہ بنائے اور مقبول بنا کر آخرت کے لئے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین ثم آمین۔

واللہ الھادی وھو یھدی السبیل

بِسمِ اللہِ الرَّحمنِ الرَّحِیمِ

مولانا محمد عثمان یحییٰ
مدرس جامعہ مصباح العلوم محمودیہ
منظور کالونی، کراچی۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ!

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ جن کا نام نعمان بن ثابت ہے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فقہائے امت میں ممتاز مقام کے مالک ہیں جن کے درس حدیث سے امام بخاریؒ امام مسلمؒ امام ابوداؤدؒ وغیرہ جیسے جلیل القدر محدثین بالواسطہ فیضیاب ہوئے اور جن کے درس فقہ فی الدین سے امام محمدؒ امام ابو یوسفؒ امام زفرؒ جیسے فقہائے ملت نے حصہ وافر حاصل کیا۔ آپ بیک وقت محدث، مفسر، فقیہہ اور احسان وسلوک کے عظیم مرتبہ پر فائز تھے۔

آپ کی سوانح حیات پر لکھنے والے ہر دور میں لکھتے رہے۔ بہت کچھ لکھا جا چکا، لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

ہمارے محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے افراد امت کے عمومی مزاج اور وقت کی ایک اہم ضرورت کے تقاضے کو ملحوظ رکھ کر یہ کتاب جو اپنے موضوع کے اعتبار سے پُر مغز مستند اور جامع ہے لکھ ڈالی ہے (مجھے میرے مربی و مشفق پیر طریقت حضرت حافظ عبدالقیوم نعمانی دامت برکاتہم نے مطالعہ کے لئے دی۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا) ماشاء اللہ مؤلف نے جس محنت و عرق ریزی اور ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے یہ گراں قدر سوغات امت کے حضور پیش کی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ رب تعالیٰ مؤلف کی ان کوششوں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اس سلسلۂ تالیف کو زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور مؤلف کو دارین کی سعادتوں سے نوازے آمین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ڈاکٹر تنویر احمد طاہر
ڈائریکٹر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
معروف تاریخ دان

محترم جناب مشتاق قریشی نے ایک اور کتاب تیار کرلی ہے۔ اُن کی لگن، محنت شاقہ اور بسیار نویسی کا یہ عالم ہے کہ پہلی کتاب ابھی تقسیم نہیں ہو پاتی کہ دوسری اشاعت پذیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک اور کتاب اور وہ بھی پیچیدہ تحقیق طلب موضوعات پر اتنے دنوں میں لکھ لیتے ہیں جتنے دنوں میں، میں ان کی کتاب پر تبصرہ بھی نہیں لکھ پاتا۔

''حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حیات و فقہی کارنامے'' ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جو انہوں نے حسب سابق انتہائی سلیس اور آسان اردو میں تحریر کی ہے۔ عوام الناس اور دینی طلبا کو اس نوع کی تعارفی کتاب دستیاب نہیں تھی، وہ ابوحنیفہؒ کا نام تو جانتے ہیں، ان کے مقلد بھی ہیں اور فقہ حنفیہ کے پیروکار بھی لیکن اُن کی حیات اور اسلامی فقہ کی ترویج اور ترقی میں ان کے کردار سے قریباً نابلد ہیں۔ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ سے متعلق جو کتب دستیاب ہیں وہ انتہائی دقیق، پیچیدہ، قانونی اور مذہبی اصطلاحوں میں تحریر کردہ ہیں جن سے میرے جیسے عام آدمی کو استفادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ جناب ابوحنیفہ سنی مسلک کے امام ہیں اور ان کی تعلیمات فقہ حنفی کی اساس ہیں جو بعض امور پر عالم اسلام کی دوسری بڑی فقہ، فقہ جعفریہ سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان دونوں فرقوں کے پیروکاروں یعنی سنی شیعہ اختلاف کی بنیادیں تلاش کی جائیں۔ اس مختصر تحریر کے ذریعے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سنی شیعہ تفریق بنیادی طور پر اسلامی تاریخ کا ایک سیاسی مظہر ہے اور جیسا کہ مشتاق قریشی نے واضح کیا ہے دونوں فرقوں کے مابین دین کے بنیادی ارکین کے بارے میں محض جزوی اختلافات ہیں۔

اس کتاب میں جناب مشتاق قریشی نے حضرت ابوحنیفہ کی حیات اور سیرت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اگرچہ مختصر طور پر ہی سہی لیکن دیگر فقہوں سے موازنہ بھی کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد حنفی فقہ سے تعلق رکھتی ہے تاہم یہاں اہل حدیث اور انتہائی قلیل تعداد میں حنبلی اور شافعی بھی موجود ہیں لیکن سنی فقہ کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی اقلیت شیعہ فرقہ ہے۔ جناب مشتاق قریشی نے غیر جانبداری سے ان دونوں فرقوں کے مابین مذہبی اور فقہی اختلافات کو بھی بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بیان مزید وضاحت اور تفصیلات کا متقاضی تھا۔

اسلامی سلطنت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے سے نئے مسائل اور مباحث نے جنم لیا۔ ریاست اور مذہب دو الگ شعبے قرار پائے اور علماء نے مذہب کی تدوین' تشریح اور ترویج کا کام سنبھال لیا۔ صحابہ کرامؓ اور تبع تابعین کی رحلت کے بعد احادیث کو جمع کرنے' قرآن' سنت اور احادیث کی روشنی میں نئی معاشرت اور طرز زندگی کے نئے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے اجتہاد اور قیاس کا آغاز ہوا جس میں امام ابوحنیفہؒ نے علم الکلام' منطق اور دانش و عقل کے ذریعے نمایاں مقام حاصل کیا۔ جناب مشتاق قریشی کی زیر تبصرہ کتاب امام ابوحنیفہؒ کے اس کردار کو اجاگر کرتی ہے جس کے لئے وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس کار خیر کو مقبولیت کا درجہ دے اور انہیں اجر عظیم عطا فرمائے آمین

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عرض مولف

کئی بار ایسا ہوا کہ علم کے جویا افراد نے حنفی مسلک کے بارے میں سوالات کئے اور حنفی فقہ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی بابت دریافت کیا۔ اس بارے میں چونکہ خود میرا علم محدود تھا' اس لیے صرف اتنی ہی بات کرتا جتنی علم میں ہوتی۔ پھر میں نے خود علماء کرام سے اس بارے میں علم حاصل کرنے کی کوشش کی اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں سوالات کرنا شروع کئے تو مجھ پر علم کے دروازے کھلتے چلے گئے' اس سے قبل میرا علم اتنا ہی تھا کہ فلاں کتاب بڑی اہم ہے اور سند کا درجہ رکھتی ہے' لیکن تفصیلی علم یا امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ابتدائی معلومات کے سوا مزید کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اتنا تو میں نے کئی جگہ پڑھا تھا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا اصل نام نعمان بن ثابت تھا وہ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا وصال ۱۵۰ ہجری میں ہوا تھا۔ وہ فقہ حنفی کے مورث اعلیٰ و بانی تھے اور فارسی الاصل تھے۔ امام اعظمؒ ان کا لقب تھا۔ علم فقہ انہوں نے اپنے استاد حماد بن ابی سلیمانؒ سے حاصل کیا جو کوفہ میں ہی تعلیم و تدریس میں مشغول تھے اور اپنے وقت کے بڑے جید عالمِ دین تھے' وہ بڑے ہی معاملہ فہم اور ذہین انسان تھے۔ امام اعظمؒ کا اولین مأخذ قرآن و سنت تھا' پھر اقوالِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین۔ اس کے بعد اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔ خلیفہ وقت ابوجعفر منصور نے آپ کو قاضی کے عہدے کی پیش کش ہی نہیں کی بلکہ اس پر بے حد اصرار بھی کیا' لیکن امام اعظمؒ نے صاف انکار فرما دیا جس پر اس نے امام کو قید کر دیا اور اسی قید و بند کی حالت میں آپ کا وصال

ہوا۔

اس کے علاوہ علمی معلومات کے لیے میں نے مزید کوشش کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام اہلِ علم نے اردوداں طبقے کے لیے جن کتب کا امام اعظمؒ کی سیرت وحیات کے بارے میں ترجمہ کیا وہ عربی سے کئے گئے ایسے ترجمے تھے جو یا تو تحت اللفظ تھے یا ترجمہ تو کسی حدتک آسان کیا۔ لیکن ترتیب وہی رہنے دی جو دینی علوم کے مدارس میں تعلیم پانے والے کی حدتک تو بڑی مفید و کارآمد ہوسکتی ہے لیکن ایک عام پڑھا لکھا شخص اگر ان کتب سے فیض یاب ہونا بھی چاہے تو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ علمائے کرام کے نزدیک امام اعظمؒ پر سب سے کارآمد کتاب سرتاج محدثین یعنی سیرۃ امام اعظم ابوحنیفہؒ قرار پائی جس کے مترجم حضرت مولانا عبدالغنی طارق صاحب ہیں۔ یہ کتاب تین کتب کے ترجمے پر محیط ہے۔ اس میں پہلی کتاب علامہ ابن حجر شافعیؒ کی ''الخیرات الحسان'' ہے دوسری حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ کی ''تبییض الصحیفہ'' ہے اور تیسری اور آخری کتاب حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری کی 'المواہب الشریفہ' ہے ان کتب کے علاوہ اردو میں شمس العلماء حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ کی کتاب سیرۃ النعمان (کامل) ہے' جسے انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری کا عنوان دیا ہے۔ ایک اور کتاب دستیاب ہے جسے جناب رئیس احمد جعفری صاحب نے ترجمہ کیا ہے' یہ کتاب محمد ابوزہرہ مصری کی تصنیف ہے جسے جعفری صاحب نے امام ابوحنیفہؒ عہد وحیات فقہ وآراء کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے' ایک کتاب ''حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی صاحب کی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' اس کے ساتھ ہی ایک کتاب تذکرۃ النعمان جو علامہ محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعی کی ہے جس کا ترجمہ حضرت مولانا محمد عبداللہ بستوی مہاجر مدنی نے کیا ہے اور ایک کتاب فلسفۃ التشریع فی الاسلام ڈاکٹر صبحی محمصانی جس کا اردو میں ترجمہ مولوی محمد احمد رضوی صاحب نے کیا ہے' نظر سے گزری۔

یہ سب کتب علمی و ادبی زبان میں اس طرح ترجمہ و تالیف کی گئی ہیں کہ عام قاری ان سے اس طرح مستفید نہیں ہو سکتا جس طرح وہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے بارے میں مستفید ہونا چاہتا ہے یا ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ ہم جس فقہ کے ماننے والے ہیں' اس کے بارے میں' اس کے امام کے بارے میں' کوئی ایسی مختصر اور جامع کتاب تحریر یا تالیف کی جائے جس سے آج کا نوجوان طبقہ امام اعظم ابو حنیفہؒ سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہو سکے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کوفہ سے جس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر کام کا آغاز کیا تھا وہ مشرق کے مسلمانوں کی زندگی کا دستور و آئین بن گیا۔ تمام مشرقی ممالک میں حنفی فقہ کا نفاذ ہوا' جبکہ مغربی علاقوں میں امام مالکؒ کے نکتہ نظر کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس طرح مسلمانان عام کو امراء اور بادشاہوں کے ذاتی خیالات و جذبات سے نکل کر اپنے دین کے تحت اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح فقہ حنفی کے امام حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے مسلمانوں کے لیے زندگی کو قرآن و سنت ﷺ کے مطابق بسر کرنا آسان بنا دیا اور تقریباً تمام فقہی مسائل کو حل کر دیا اور اہلِ اسلام کی الجھن و پریشانیوں کو دور کر دیا۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی حیات و کارناموں کے بارے میں میرا کچھ لکھنا یا مختلف کتب سے تلخیص کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا' لیکن وقتی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک کوشش ہے جو اللہ کرے کہ اردو زبان آشنا نوجوانوں کے کسی کام آ سکے۔ اور یہ تالیف امام اعظمؒ کے مقام و مرتبے کو قاری تک درست انداز میں منتقل کر سکے۔

امام ابو حنیفہؒ کی جودتِ طبع' وسعت نظر' وسعتِ معلومات' قوت ایجاد' ان کے تمام کمالاتِ علمی کا آئینہ ہے۔ فقہ کی ترتیب و تدوین سے ان کو بلند ترین مرتبہ حاصل ہوا۔ امام اعظمؒ کی نکتہ آفرینی اور مناظرات اور ان سے متعلق لکھنے والوں اور سیرت نگاروں و مرتبین میں بڑی بڑی مشہور و معروف شخصیات بھی شامل ہیں' بغیر تحقیق بہت سی

بے سروپا حکایات وافسانے اپنی تالیفات میں شامل کردی ہیں' جن سے مخالفین کو دستاویزی سند مل گئی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ہر مشہور ومعروف شخص جس نے کسی فن میں کمال حاصل کیا ہو اور اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی' ہو اس کے بارے میں بہت سی اچھی بری باتیں اور سینکڑوں روایات از خود بنتی چلی جاتی ہیں اور بعض تو اتنی مشہور اور مقبول ہوجاتی ہیں کہ زبان زد عام ہوجاتی ہیں اور اکثر لوگ اندھے اعتقاد میں ایسی ایسی باتیں مدح سرائی میں کرجاتے ہیں' جو حقیقتاً مذموم ہوجاتی ہیں اور مخالفین کو عیب جوئی کی مثالیں بنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارے میں بعض مصنفوں نے ان کی ذہانت' ذکاوت اور طبع کے بارے میں ایسے ایسے قصے لکھ دیئے ہیں جن کو اگر اللہ نہ کرے سچ سمجھ لیا جائے تو امام صاحب کی اصل شخصیت وفن ہی ختم ہو کر رہ جائے۔ اہلِ تحقیق خصوصاً محدثین نے ہمیشہ احتیاط کا دامن تھامے رکھا اور صرف ایسی روایات کو قلم بند کیا جو بلاشبہ صحیح ثابت ہوئیں۔ اس میں کوئی شبہ ہے نہ دو رائے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کو دیگر ائمہ کی نسبت مناظرے اور مباحثے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے۔ انہوں نے علوم شرعیہ سے متعلق بہت سے ایسے نکتے ایجاد کیے جو عام طبیعتوں کی دسترس میں نہیں تھے۔ اس وجہ سے بہت سے مخالفین نے ان کو غلط ثابت کرنے اور بدنام کرنے کے لیے ان کے خلاف بہت سے حربے استعمال کیے۔ اس کتاب میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کو کسی الجھن' پریشانی اور غلط فہمی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیرت کے مثبت پہلوؤں کو یکجا کیا گیا ہے اور مخالفت میں کہے گئے جملے اور مناظرے کو گفتگو میں شامل نہیں کیا گیا' کیونکہ اس سے دیگر کتب مناقب امام اعظمؒ بھری ہوئی ہیں۔ کوشش یہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ آسان اور موثر انداز میں پیش کی جائے' تاکہ قاری بآسانی امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیرت اور کام سے واقف ہوسکے۔

عام تذکروں اور سیرت کی کتب میں علماء کرام کے اُن اوصاف حمیدہ کا ذکر خصوصیت

سے کیا جاتا ہے جس سے ان کی فہم وفراست، قوتِ حافظہ ذہن کی رسائی، بے نیازی، تواضع وقناعت اور زہد وتقویٰ کا تعلق ہوتا ہے، لیکن جن صفات کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے وہ عقل، رائے، فراست اور تدبیر ہیں۔ شاید یہ باتیں دین داروں کی جگہ دنیاداروں کے ساتھ مخصوص کی جاتی ہوں، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ: علماء کا گروہ انتظام ریاست سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا۔ (تاریخ ابن خلدون) یہ قطعی درست بات ہے حالانکہ علماء کرام میں ان اوصاف کا ہونا زیادہ ضروری اور اہم ہوتا ہے کیونکہ اسلام دیگر مذاہب اور دین کے برعکس دنیاوی انتظامات کا بھی اہتمام کرتا ہے، جیسا کہ خلفائے راشدین جو اسلام کے اوّل اوّل صاحب تدبیر حکمراں تھے، ان کی زندگی اور حکمرانی کے معمولات کو بغور دیکھا اور سمجھا جائے تو سیاست اور ملکی انتظامات کے لحاظ سے دنیا بھر کے سلاطین وحکمرانوں میں کون ایسا ہے جو ان کی ہمسری کر سکتا ہو۔ اگر ہم آج امام ابوحنیفہؒ کی فقہ اور ان کی مذہبی امور کے ساتھ وابستگی کو دیکھیں تو امام ابوحنیفہؒ تمام فرقوں کے علماء میں ممتاز ونمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دینی امور کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور اور ضرورتوں کو بھرپور انداز میں سمجھا اور سمجھایا ہے۔ فقہ حنفی مذہب اور سلطنت وحکومت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اسلام میں اب تک جو بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں وہ مسلکاً حنفی تھیں۔

امام ابوحنیفہؒ اگرچہ شاہی تعلقات سے ہمیشہ آزاد رہے لیکن قوم وملک کے ساتھ ان کا جو تعلق تھا اس کے فرائض کو انہوں نے اس دانائی اور ہوش مندی سے انجام دیا جو ایک مدبرِ سلطنت کے شایانِ شان تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج حنفی مسلک کے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم انسانیت کے لیے دینِ حق لے کر آئے کیونکہ دین اسلام دین آخر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے ہی نبی آخرالزماں ہیں، آپ کے بعد نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ وئی کتاب آنے والی ہے اور نہ کوئی شریعت چونکہ دینِ اسلام تمام

انسانوں کے لیے ہے اسے دنیا کے کونے کونے تک پہنچنا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش و بعثت جزیرہ نما عرب میں ہوئی لیکن آپ کے پیغام کی روشنی تمام عالم میں پھیلی۔ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ''وما ارسلنک الا کافۃ للناس'' (سبا:۲۸) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بھیجا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغامِ حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں عرب کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں، خلفائے راشدین نے، بیرون عرب کے دور دراز علاقے جو اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے پیغام قرآن کو عام کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کہ اگر ایمان ستارے ثریا پر بھی ہوگا تو دنیائے فارس میں سے کچھ لوگ اسے حاصل کر کے رہیں گے۔'' (بخاری مسلم میں یہ حدیث حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اور طبرانی نے اس حدیث کو حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے اور ابونعیم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے) چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کے مطابق امام اعظم ابوحنیفہؒ جو ائمہ اربعہ میں اہل فارس سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ (تاریخ ابونعیم)

آخر میں اس تالیف کی تدوین اور ترتیب میں بھرپور معاونت کرنے اور علمی مشوروں کے لئے میں ڈاکٹر تنویر احمد طاہر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ ان کے علم میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ آمین

مولف

مشتاق احمد قریشی

امام اعظمؒ

فقہ حنفی کے بانی امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی کنیت ابوحنیفہ ہے جو نام سے زیادہ مشہور ہے یہ کنیت حقیقی نہیں ہے کیونکہ امام صاحب کی کسی بھی اولاد کا نام حنیفہ نہیں تھا یہ کنیت نسبی بھی نہیں بلکہ وصفی ہے جیسے ابوہریرہؓ یہ وصفی معنی کے اعتبار سے اختیار کی گئی ہے۔ قرآن کریم سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرمار ہا ہے فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (ال عمران ۹۵)'' امام صاحب نے اسی مناسبت سے اپنی کنیت ابوحنیفہ اختیار کی۔ حضرت امام اعظمؒ نے سب سے پہلے اس دین حنیف کی تدوین فرمائی۔ عربی محاورے میں پہل کرنے والے کو اب (باپ کو کہا جاتا ہے اور کسی کام کے شروع کرنے والے کی عظمت کے لیے بولا جاتا ہے) کہتے ہیں کہ دین حنیف کی مکمل تدوین حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کی۔ اس لیے اہل اسلام میں آپ کی کنیت ابوحنیفہ قرار پائی اور آپ کی کنیت سے ہی آپ کے پیروکار حنفی کہلائے جیسے مدینہ سے مدنی (زمخشری)۔ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کو باقاعدہ ایک فن کا درجہ دیا اور اس کے اصل اصول مرتب کئے اور اجتہادی مسائل کو تحریر کیا۔ ان کے ان ہی عظیم الشان کاموں کے باعث انہیں امام اعظم کے لقب سے لوگ پکارنے لگے۔ ان کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ان کی سیرت پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ سن ۸۰ ہجری بمطابق سن ۶۹۹ عیسوی کوفہ میں پیدا ہوئے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شکل وصورت اور قد وکاٹھ کے بارے میں خطیبؒ بغدادی نے امام ابویوسفؒ سے روایت کی ہے کہ امام صاحبؒ نہ لمبے تھے نہ پست قامت، درمیانہ قد بڑے حسین صورت، نہایت فصیح وبلیغ اور خوش آواز تھے۔ بڑی خوش اسلوبی

سے اپنی بات پیش کیا کرتے تھے۔ خوبصورت داڑھی تھی اور ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے تھے اور اچھے جوتے پہننا اور خوشبو لگانا پسند کرتے تھے۔ آپ کے شجرہ نسب کے بارے میں محققین و مورخین اور آپ کے سوانح نگاروں اور آپ کے پیروکاروں کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

معروف محقق ابو مطیع نے امام ابوحنیفہ کو عرب النسل شمار کیا ہے اور ان کا نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی بن یحییٰ بن زید بن اسد بن راشد الانصاری۔ دوسری روایت حافظ ابو اسحٰق نے کی ہے۔ نعمان بن ثابت بن کاوس بن ہرمز بن بہرام زوطی جبکہ بغداد کے مشہور مورخ خطیبؒ نے امام اعظمؒ کے پوتے اسمٰعیلؒ سے روایت یوں نقل کی ہے۔ اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان اس نسب میں امام اعظمؒ کے پوتے اسمٰعیلؒ نے امام اعظمؒ کے دادا کا نام نعمان بتایا ہے اور پردادا کا نام مرزبان حالانکہ عام طور پر ان کے نام زوطی اور ماہ مشہور ہیں [illegible] ہے کہ زوطی کے مشرف [illegible] اسلام ہونے پر ان کا اسلامی نام نعمان سے تبدیل [illegible] یا ہو۔ اسمٰعیلؒ کے کہنے کے مطابق ان کا خاندان فارس (ایران) کا ایک معزز خاندان ہے۔ ایک اور روایت محقق مولوی غلام فردوسی مصنف مراۃ الکونین مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۵ء میں اس طرح تحریر کرتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ نعمان کوفی بن ثابت بن نحس بن یزدجرد بن شہریار بن پرویز بن نوشیروان عادل' جبکہ مولانا شبلی نعمانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عجمی تھے اور امام اعظمؒ کے دادا زوطی کابل سے ترک وطن کر کے کوفہ آئے تھے اور انہوں نے یہیں اسلام قبول کیا اور اپنا نام نعمان اختیار کیا۔ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دور خلافت تھا۔

تاریخ ایران میں ایک شخص مرزبان کا تذکرہ ملتا ہے جس نے ۳۱ ہجری سن ۶۵۲ عیسوی میں ایران کے مفرور بادشاہ یزدگرد سوم کو [illegible] فتح ہونے پر وہاں سے فرار ہو کر اصفہان [illegible] [illegible] مان اور سجستان کی راہ سے [illegible] ہوا مرو پہنچا اور مرزبان جو یہاں کا حاکم تھا

کے گھر پناہ لی کسی بات پر اختلاف ہونے پر مرزبان نے یزدگرد کو قتل کر دیا یہ وہ وقت تھا جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فتح کا پرچم لیے تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے تھے جس سے خوف زدہ ہو کر مرزبان نے ترک وطن کر کے کوفے کی راہ لی وہاں اس نے اپنے ایک مسلمان شناسا کے گھر قیام کیا جن کا تعلق بنی تیم اللہ کے قبیلے سے تھا۔ یہاں وہ مسلمانوں کے اخلاق وعادات اور طرز معاشرت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دینِ اسلام قبول کر لیا اور نعمان کا نام اختیار کر لیا۔ کوفہ میں اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ نعمان (زوطی یا مرزبان) چونکہ صاحب حیثیت تھے۔ اس لیے ان کا دربارِ خلافت میں آنا جانا ہو گیا۔ ایک بار نوروز کے دن نعمان (امام صاحب کے دادا) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فالوذج (شاہی حلوی) بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ (الخطیب) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا خاندان ایسا دولت مند صاحب ثروت تھا کہ خلیفہ وقت کی خدمت میں شاہی حلویٰ بطور ہدیہ پیش کر سکتا تھا جو اس زمانے میں صرف اہل ثروت کے دسترخوان کی ہی زینت ہوا کرتا تھا۔ ایک روز نعمان (زوطی یا مرزبان) نے اپنے بیٹے ثابت کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے بزرگانہ شفقت فرماتے ہوئے ان کی اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ جس کا ثمر امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا بچپن ایک پرآشوب دور تھا۔ اس زمانے میں عراق کا حاکم حجاج بن یوسف تھا اور مذہبی اختلافات تصادم کی حد تک عروج پر تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور خلافت تک حکمرانوں اور ان کے عمال کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں اسلامی دنیا کو کسی قدر سکون نصیب ہوا اور مذہبی علوم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ امام زہریؒ نے احادیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ امام ابوحنیفہؒ جواب تک اپنے والد کے کام میں ہاتھ بٹاتے رہے تھے جو ریشمی کپڑا بنا کر اس کی تجارت کیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ اپنی جوانی تک ریشمی کپڑے کی

تجارت کرتے رہے جو باپ دادا کی میراث تھی جس کو انہوں نے بڑی ترقی دی۔ امام زہری ؒ نے جو مجموعہ احادیث تیار کیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی نقلیں بنوا کر ممالک اسلامیہ میں پھیلایا۔ اب درس و تدریس کے چرچے عام ہونے لگے تو امام ابوحنیفہؒ جن کی عمر اس وقت تقریباً بیس اکیس برس کی تھی کہ ان میں علم حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ امام صاحبؒ نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو عراق مختلف اقوام کا ملغوبہ نظر آتا تھا۔ آراء فتن ظاہر ہونے لگے تھے۔ سیاسیات اور عقائد کی آویزشیں' شیعہ' خوارج' معتزلہ وغیرہ فرقے یہاں جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے مذہبی انتشار اور مسائل کا انبار لگا ہوا تھا گو کہ مجتہدین اور تابعین کی جماعت بھی موجود تھی جنہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے فیض حاصل کیا تھا۔ ایک طرف علوم دینیہ کا چشمہ جاری تھا تو دوسری طرف مسائل متنازعہ اور آراء متضادہ کا بھی شور تھا اور خوارج اچانک حلقہ درس میں گھس آتے اور اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہوئے الٹے سیدھے سوالات کرتے۔ ایسے ماحول میں وہ ایک دن بازار جا رہے تھے کہ کوفہ کے مشہور امام شعبیؒ اپنے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے نوجوان نعمان کو اپنے پاس یہ سمجھ کر بلایا کہ وہ کوئی طالب علم ہے۔ انہوں نے پوچھا نوجوان کہاں جا رہے ہو' تو نعمان (ابوحنیفہؒ) نے ایک سوداگر کا نام لیا کہ میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔ اس پر امام شعبیؒ نے پوچھا کہ تم پڑھتے کس سے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو کسی سے بھی نہیں پڑھتا۔ امام شعبیؒ نے کہا مجھے تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔

امام شعبیؒ کی اس نصیحت نے ان کے دل میں گھر کر لیا اور انہوں نے نہایت اہتمام سے تحصیل علم پر توجہ دینی شروع کر دی۔ اس وقت کا علم آج کل کا علم نہیں تھا۔ اس وقت علم کے طور پر ادب' انساب' ایام العرب' فقہ' حدیث اور علم کلام تھے۔ علم کلام میں اسلامی مسائل پر فلسفہ کا غلبہ تھا۔ اسلام جب تک عرب کی آبادی میں محدود رہا اس کے مسائل نہایت ...

اور صاف رہے لیکن جیسے جیسے اسلامی مملکت کی حدود پھیلتی گئیں اسلام بھی عرب سے نکل کر فارس' مصر سے شام تک پہنچ گیا جہاں اب مسائل میں رنگ آمیزیاں شروع ہوگئیں گو کہ ان ممالک میں حکمت وفلسفے کا خاصہ زور تھا اور فلسفے کے بگڑے ہوئے مسائل عام لوگوں میں پھیل رہے تھے اور لوگوں کی طبیعتیں باریک بینی اور احتمال آفرینی کی طرف مائل تھیں۔ امام صاحبؒ نے علم کلام سے تحصیلِ علم کی ابتداء کی جو بحث ومناظرے پر محیط تھا۔ اور اس علم میں اتنی مہارت واستعداد حاصل کرلی کہ بڑے بڑے استادِفن ان کے مقابلہ میں آنے سے کتراتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں اکثر بصرہ کا سفر درپیش رہتا' وہاں کئی معروف اساتذہِ فن سے الگ مباحثے ہوتے جن سے ان کے علم میں پختگی آتی چلی گئی اور ان کا تجربہ بڑھتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ شدید احساس ہونے لگا کہ علم کلام میں معروف اہل علم کا طرز عمل مناسب نہیں اس سے ان میں بد دلی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ ان لوگوں میں اخلاقی پاکیزگی اور روحانی اوصاف کا فقدان تھا۔

امام شعبیؒ کی نصیحت اور ہدایت کام کرگئی۔ اس سے متاثر ہوکر امام ابوحنیفہؒ نے اپنی پوری توجہ حصولِ علم پر صرف کردی اور علمائے کرام کے حلقوں میں مستقل آنا جانا شروع کردیا۔ ایک بار آپ کے پاس ایک عورت آئی اس نے سوال کیا کہ ایک مرد نے لونڈی سے نکاح کررکھا ہے۔ اب وہ اسے سنت کے مطابق طلاق دینا چاہتا ہے تو کتنی طلاقیں دے؟ اس پر انہوں نے اس عورت سے کہا۔ قریب ہی حماد بن ابی سلیمانؒ کا حلقہ درس ہے وہ ان کے پاس چلی جائے اور واپسی میں مجھے بھی بتا کر جائے کہ انہوں نے کیا کہا۔ چنانچہ وہ عورت امام حمادؒ کے پاس گئی اور ان سے سوال کیا اور واپسی میں وہ امام ابوحنیفہ کو بتانے آئی کہ میں نے حمادؒ سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا حیض وجماع سے پاک ہونے کی حالت میں اسے ایک طلاق دے پھر اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دو طہر (دوسرے حیض سے پاک ہونا)

گزر جائیں جب وہ دوسرے حیض سے پاک ہوکر غسل کرلے۔ پھراس کا کسی دوسرے سے نکاح حلال ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے عورت کی یہ بات سنی اور فوراً ہی انہوں نے فیصلہ کرلیا اور اٹھ کر حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے اور ان سے مسائل سننے لگے اور یاد کرنے لگے۔ جب دوسرے دن استاد حمادؒ دریافت کرتے تو دیگر طلبہ تو بھول چوک جاتے تھے لیکن امام ابوحنیفہؒ کو وہ سب پوری طرح ازبر ہوتے۔ یہ دیکھ کر استاد حمادؒ نے ان سے کہا کہ آئندہ میرے قریب بیٹھا کرو۔ امام صاحبؒ کو اپنے وقت کے تمام علوم پر دسترس حاصل تھی۔ پہلے انہوں نے امام عاصمؒ کی قرأت کے مطابق قرآن پاک حفظ کیا پھر علم حدیث شعرو ادب اور صرف ونحو میں مہارت حاصل کی اور پھر فقہ کے لیے وقف ہو کر رہ گئے اور اپنے استاد حمادؒ بن ابی سلیمان کی شاگردی ایسی اختیار کی کہ جب تک وہ زندہ رہے امام صاحبؒ نے ان کا دامن نہ چھوڑا۔ اس وقت تک وہ چالیس برس کے ہو چکے تھے کیونکہ استاد حمادؒ بن ابی سلیمان کی وفات ۱۲۰ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی امام صاحبؒ نے درس وتدریس کا آغاز کیا۔ امام صاحبؒ ۱۸ سال تک حمادؒ کی شاگردی میں رہے کیونکہ اس وقت تک وہ جسمانی اور عقلی اعتبار سے حدِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ (تاریخ بغداد) امام اعظمؒ کو حمادؒ کی صحبت اور پختگی عمر نے درس وتدریس کی ضرورتوں سے اچھی طرح آگاہ کردیا تھا۔ انہوں نے ایک مستقل حلقہ درس وتدریس قائم کرلیا۔ امام صاحبؒ اپنے استاد حمادؒ کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے مستفیض ہوئے تھے۔ وہ جب حج کے لیے جاتے تو وہاں مکہ اور مدینہ شریف کے علما اور مشائخ سے بھی ملاقاتیں کرتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ ان کی یہ ملاقاتیں اکثر تابعینؒ کرام سے ہوتی تھیں۔ تابعینؒ حضرات سے ملاقاتیں خالص علمی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ جن میں روایت حدیث اور فقہ پر گفتگو ہوتی تھی۔ (مراۃ الکونین) امام ابوحنیفہؒ نے اپنے استاد حمادؒ کے علاوہ دوسرے فقہاء سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جہاں جہاں اور جب جب انہیں کسی تابعی محدث

کا پتہ چلتا وہ وہاں پہنچ کر ان سے ملتے اور علم حدیث حاصل کرتے۔ ایسے تابعین جنہیں صحابہ کرام سے براہ راست شرف اتصال حاصل تھا اور جو فقہ واجتہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے ان کے بارے میں امام اعظمؒ خود فرماتے ہیں۔ ''میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ علی رضی اللہ عنہٗ عبداللہ بن مسعودؓ ابن عباسؓ فقہ کے خصوصی اصحاب اور تلامذہ سے حاصل کیا۔

امام ابوحنیفہؒ کی علم کی تلاش وحصول علم کی پیاس استاد حمادؒ تک محدود نہ تھی۔ انہیں جہاں جہاں اور جیسے جیسے علم فقہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتیں اسے حاصل کرتے تھے۔ امام صاحبؒ علم کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ وہ فوراً مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کے حل میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ مسائل کے اصول سے پوری طرح واقف تھے اس لیے وہ مسائل کی بنیاد بہ آسانی قائم کرلیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا عہد علم وفکر اور مناظرے کا عہد بن گیا تھا۔ وہ مختلف فرقے کے افراد نے مناظرے کیا کرتے اور آپ کے جواب مخالفین کے منہ بند کردیا کرتے۔ حدیث کے فہم میں امام صاحبؒ کے پائے کا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ الفاظ اور کلام کے سیاق وسباق کے مابین استنباط کرلیا کرتے تھے۔ حدیث کے فہم میں صرف ظاہری الفاظ پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے معنی سمجھ کر اسے مربوط کرکے احکام نکالا کرتے تھے۔ امام صاحبؒ بلا تحقیق کسی بات پر متفق نہیں ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ اپنے استاد امام حمادؒ سے بھی اکثر مسائل میں اختلاف کرتے تھے اور فہم وعقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر کسی بھی چیز کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ہر چیز کو وہ اپنی عالمانہ سوچ اور کتاب وسنت کے مطابق یا فتاویٰ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین پر پرکھتے' اس کے علاوہ کسی چیز کے سامنے نہ جھکتے تھے تابعین کے اقوال کو وہ پوری طرح پرکھتے اور ان کی صحت وسقم کا حکم لگاتے تھے۔ کیونکہ تابعین کی رائے ان کے خیال میں واجب التقلید نہیں تھی۔ امام صاحبؒ نہایت بیدار مغز اور ذہین انسان تھے۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ مدمقابل کو کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے۔

روایات حدیث کے سلسلے میں اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث کو جب تک متعدد طریقوں سے نہ معلوم کرلیا جائے اس وقت تک اس کے مفہوم اور تعبیر کا درست تعین نہیں ہوتا تھا۔ امام اعظمؒ کو امام حمادؒ کی صحبت اور پختگی عمر نے ان تمام ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے نہایت اہتمام اور درست طریقے سے حدیثوں کے معتبر نامعتبر ہونے پر توجہ دی۔ کوفہ میں کوئی ایسا محدث نہیں تھا جس سے امام اعظمؒ نے علم نہ حاصل کیا ہو اور اس کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کئے ہوں آپ کو مختلف ذرائع اور متعدد درس گاہوں سے گو کہ احادیث کا بڑا ذخیرہ میسر آیا تھا لیکن ان کی تکمیل سند کے لیے حرمین جانا ضروری تھا جو اسلامی مذہبی علوم کے اصل اور بڑے مراکز تھے۔

جس زمانے میں امام اعظمؒ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اس وقت وہاں درس و تدریس کا بڑا زور اور اہتمام تھا۔ حضرت عطا ابن ابی رباحؒ کا حلقہ درس بہت بڑا اور مستند تھا۔ امام اعظمؒ استفادہ کی خاطر جب عطا ابن ابی رباحؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ سے دریافت کیا۔

''تمہارا عقیدہ کیا ہے؟''

تو جواب میں امام اعظمؒ نے فرمایا: ''میں اسلاف کو برا نہیں کہتا' گناہ گار کو کافر نہیں سمجھتا' قضا و قدر کا قائل ہوں۔''

یہ جواب سن کر عطا ابن ابی رباحؒ نے آپ کو اپنے درس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ روز بروز ان کی ذہانت کو جلا ملتی گئی اور تھوڑے ہی دنوں میں عطا بن ابی رباحؒ نے آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دے دی جب امام اعظمؒ مدینہ پہنچے تو وہاں آپ کی ملاقات سالمؒ بن عبداللہ بن عمر بن خطابؓ اور سلیمانؒ سے بھی ہوئی۔ اور ان سے احادیث روایت کیں۔ امام اعظمؒ جب مدینہ اور مکہ شریف تشریف لاتے تو کئی کئی مہینے تحصیل علم کے لیے وہاں قیام فرماتے

تھے۔

حج کے موقع پر ممالک اسلامیہ کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے جید اہلِ علم اور صاحبانِ کمال مکہ تشریف لاتے تھے۔ امام اعظمؒ اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے جبکہ آپ کی شہرت کوفہ سے نکل کر دور دراز ممالک اسلامیہ تک پہنچ چکی تھی۔ ان ہی دنوں امام اعظمؒ کے ایک شاگرد عبداللہ بن مبارکؒ نے بیروت کا سفر اختیار کیا تاکہ وہاں جاکر امام اوزاعیؒ کی درس گاہ سے فن حدیث کی تکمیل کر سکیں جب ان کی ملاقات امام اوزاعیؒ سے ہوئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ کوفہ میں ابوحنیفہ کون ہے؟ جو دین میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے؟

ابنِ مبارکؒ نے اس وقت تو کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے اپنے گھر چلے آئے۔ دو تین دن بعد وہ اپنے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کی کچھ تحریریں لے کر امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے امام اوزاعیؒ نے وہ پڑھیں' ان پر لکھا تھا قال نعمان بن ثابت۔ تو امامؒ نے ابنِ مبارکؒ سے دریافت کیا کہ یہ نعمان کون بزرگ ہیں؟ اس پر ابن مبارکؒ نے کہا حضرت یہ عراق کے ایک صاحب ہیں جن کی صحبت میں میں رہا ہوں اور جن کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ وہ دین میں نئی نئی باتیں نکال رہے ہیں۔

ایک بار حج کے موقع پر جب امام اوزاعیؒ مکہ تشریف لے گئے تو ان کی ملاقات امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ہوئی اس ملاقات کے وقت امام اعظمؒ کے ساتھ ابن مبارکؒ بھی تھے۔ ابن مبارکؒ کا قول ہے کہ اس موقع پر امام اعظمؒ نے ایسی خوبی سے تقریر فرمائی کہ امام اوزاعیؒ حیران رہ گئے اور امام ابوحنیفہؒ کے جانے کے بعد بولے کہ اس شخص کے کمالِ علم نے اسے لوگوں میں مقبول بنا دیا ہے۔ بلاشبہ میری وہ بدگمانی تھی' جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس کے باوجود تاریخ ابوحنیفہؒ سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے امام اوزاعیؒ کی شاگردی بھی اختیار کی تھی۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ جب دوسری بار مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہ حضرت امام باقرؒ کی خدمت میں حصول علم کے لیے حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا تم ہی اپنے قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نہایت ادب سے کہا۔ ''عیاذاباللہ'' حدیث کی کون مخالفت کرسکتا ہے۔ انہوں نے امام باقرؒ سے کہا کہ آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں۔ اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ نے سوال کیا: یا حضرت! مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؒ نے کہا: عورت۔

امام اعظمؒ: وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقرؒ: مرد کا۔

امام اعظم: میں اگر قیاس لگاتا تو یہ کہتا کہ عورت چونکہ ضعیف ہے لہٰذا اس کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ پھر عرض کیا: نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقرؒ: نماز افضل ہے۔

امام ابوحنیفہؒ: اس اعتبار سے جب عورت ایام سے پاک ہو جائے تو اس پر نماز کی قضاء واجب ہونی چاہئے نہ کہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزے کی ہی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔ لیکن جو دین آپ کے جد امجد کا ہے اسے قیاس سے تبدیل نہیں کرتا۔

امام ابوحنیفہؒ نے ایک اور سوال کیا: پیشاب زیادہ نجس ہے یا نطفہ؟

امام باقرؒ نے جواب دیا: پیشاب زیادہ نجس ہے۔ اس پر امام ابوحنیفہؒ نے کہا: اگر دین میں قیاس کو داخل کرتا تو میں کہتا کہ پیشاب کے بعد غسل کرنا چاہئے اور اخراج منی کے بعد وضو مگر معاذاللہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قیاس سے دین کو تبدیل کردوں۔

ان کے جوابات سے سیدنا امام باقرؒ اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر امام اعظمؒ کی پیشانی

چوم لی۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ وحدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ (مناقب مالکی)

امام اعظمؒ کے علم کی طرح آپ کی ذہانت اور طباعی بھی ضرب المثل ہے۔ غیر معمولی ذہانت کے باعث ہی عظیم الشان ذخیرہ علم پر عبور حاصل کر کے اپنے آپ کو بانیانِ علوم کی صف میں لا کھڑا کیا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارے میں امام ابن مبارکؒ کا کہنا ہے کہ آثار اور فقہ فی الحدیث کے لیے ایک ''مقیاس'' صحیح پیدا کرنا وہ لازوال علمی کارنامہ ہے جو ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کے نام سے منسوب رہے گا۔ ''مقیاس'' کے بارے میں بعض محدثین نے ''رائے'' کے لفظ کو استعمال کئے ہیں۔ مقیاس اور ''رائے'' کی بحث نے محدثین سے فقہ کے متعدد ابواب مرتب کرا دیئے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زائد ہے۔

امام ابوحنیفہؒ میں وہ اعلیٰ ترین صفات پائی جاتی تھیں جن کے باعث انہوں نے طبقہ علماء میں بلند مقام حاصل کیا' وہ ایک عالمِ حق پسند صاحب ذہن رسا' برجستہ فکر' برجستہ گو' مرد ثقہ تھے۔ امام صاحبؒ کو اپنی طبیعت پر حد درجہ قابو حاصل تھا۔ وہ کبھی ناشائستہ بات سن کر بھی برہم نہیں ہوتے تھے۔ ہر قسم کی دشنام طرازیاں بھی انہیں راہِ حق سے ہٹا نہیں سکتی تھیں۔ وہ باشعور ذہن کے مالک تھے ان میں بڑا حلم وسکون اور وسعت نظر پائی جاتی تھی۔ وہ ایک پرہیزگار شخصیت کے مالک تھے۔

وہ ہر ایسے عمل وبات پر بڑا غور وفکر کیا کرتے جس سے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہو اور ہر قسم کی اخلاقی گراوٹ سے پاک ہو۔ امام صاحبؒ گہری سوچ فکر کے مالک تھے۔ وہ بحث ونظر میں ظاہری عبارت پر تکیہ نہیں کرتے تھے بلکہ مسائل کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے

تھے۔ وہ کسی معاملہ پر غور وفکر میں اپنی سوچ کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہر قسم کی کمزوری اور تذبذب کے بغیر اس پر بحث کرتے وہ بحث وتمحیص سے ہی احادیث کی گہرائی اور درستگی تک پہنچتے تھے۔ وہ احکام کے علل سے بحث کرتے جب تک درست طور پر علت کا تعین نہیں ہو جاتا اس پر قیاس نہ کرتے۔ اکثر لوگ فرضی مسائل اور احوال پیش کرتے۔ امام صاحبؒ اپنی حاضر جوابی' برجستہ کلامی سے جواب دیتے' وہ نہ اپنی فکر کو روکتے تھے نہ کسی پر کوئی پابندی عائد کرتے جب تک حق ان کا ساتھ دیتا اور دلائل سامنے ہوتے تو وہ بحث کرتے رہتے تھے۔ وہ ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہ خوبی جانتے تھے کہ مدمقابل کو کیسے زیر کیا جا سکتا ہے۔

امام صاحبؒ طلبِ حق میں مخلص تھے۔ یہی وہ صفتِ کمال تھی جس نے ان کے قلب وبصیرت کو منور کر رکھا تھا' کیونکہ جس شخص کا دل اخلاص کی دولت سے مالا مال ہو وہ خواہشاتِ نفسانی اور خود غرضی سے بلند ہو کر مسائل دینی کو سمجھتا سمجھاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی عقل وفکر میں استقامت پیدا فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص خود فریبی کے پھندے میں پھنس جائے وہ حرص وہوس کا غلام بن جاتا ہے اس کا ہر قدم گمراہی کی طرف اٹھتا ہے اسے اپنی غلطیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ امام صاحبؒ ہمیشہ اپنے ذاتی میلان سے بلند ہو کر صحیح بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ اس بات سے بہ خوبی آگاہ تھے کہ علم فقہ' علم دین کا دوسرا نام ہے اور جس شخص پر اس کا ذاتی میلان حاوی ہو وہ کبھی دین کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ امام صاحبؒ ہمیشہ اپنے آپ کو حق کا تابع رکھتے تھے۔ بحث ومباحثے میں بھی وہ حق کا ساتھ دیتے تھے۔ اگر ان کا مدمقابل حق کہہ رہا ہوتا تو بلا تامل اسے تسلیم کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی رائے کو کبھی حق کا درجہ نہیں دیتے تھے۔

طلب حق میں امامؒ کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی صحیح حدیث پیش کرتا جس میں کسی قسم کے طعن کی گنجائش نہ ہوتی یا صحت سند کے ساتھ کسی صحابی کا فتویٰ بیان کرتا تو آپ

پر حق کی خاطر فوراً اپنی رائے ترک کردیتے اور اس حدیث یا فتوے کے مطابق مسلک واضح کر لیتے۔ فقہ و دین کے معاملے میں امام صاحبؒ سراپا اخلاص تھے۔ اپنے اخلاص کے باعث وہ باوجود وسعتِ عقل کے دوسروں کی آراء قبول کرنے میں تعصب نہیں برتتے تھے۔ ان کے صحیح ثابت ہونے پر نہایت وسعت قلب کے ساتھ قبول کرلیا کرتے تھے۔ امام صاحبؒ انتخاب احادیث میں بہت محتاط تھے۔ صرف وہی احادیث قبول کرتے تھے جو قابل اعتماد سند سے ثابت ہوتیں۔ اس کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے احادیث کے پندرہ مجموعے (پندرہ مسانید) آپ سے روایت کئے ہیں۔ (تاریخ الفقہ الاسلامی ڈاکٹر عبدالقادر) جبکہ ابوالموید محمد بن محمود خوارزمی نے ایک جلد میں ''جامع المسانید'' کے نام سے جمع کی ہیں۔

امام اعظمؒ میں اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی ودیعت فرمائی تھی کہ انسان ان کی طرف از خود مائل ہوجاتا تھا۔ امام صاحبؒ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے شاگردوں، طالب علموں پر اپنی رائے مسلط نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ مذاکرہ کرکے کوئی آخری رائے قائم کیا کرتے جسے سب خاموشی سے تسلیم کرلیا کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ کی حضرت شعبہؒ کے ساتھ خاص نسبت وانسیت تھی۔ شعبہؒ ان کی موجودگی میں اور عدم موجودگی میں ان کی ذہانت، عقل اور فہم کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کہا کہ میں جانتا ہوں کہ جس طرح آفتاب روشن ہے ایسے ہی علم اور ابوحنیفہؒ ہم نشین ہیں۔ حضرت شعبہؒ جو بڑے پائے اور مرتبے کے محدث مانے جاتے تھے، عراق میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جرح وتعدیل کے مراتب مقرر کیے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ: شعبہؒ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج ہی نہ ہوتا۔ حضرت شعبہؒ نے امام ابوحنیفہ کو حدیث روایت کرنے کی اجازت دی۔ امام بخاریؒ کے استاد یحییٰؒ سے کسی شخص

نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا ابوحنیفہؒ کے بارے میں اس قدر کہنا ہی کافی ہے کہ شعبہؒ نے انہیں حدیث روایت کرنے کی اجازت دی اور شعبہ آخر شعبہ ہے۔ بصرہ کے شیوخ جن سے امام ابوحنیفہؒ نے حدیثیں روایت کیں ان میں عبدالکریمؒ بن امیہ اور عاصمؒ بن سلیمانؒ الاحوال کے نام زیادہ ممتاز ہیں۔

حضرت عطاؒ مشہور تابعی تھے وہ اکثر صحابہ کرام کی خدمت میں رہے تھے۔ ان کے فیض صحبت سے اجتہاد کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ' حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن زبیر، اسامہ بن زید، جابر ابن عبداللہ، زید بن ارقم، عبداللہ بن سائب، عقیل، رافع، ابودردا' حضرت ابوہریرہ اور بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے احادیث نبویؐ کو سنا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ: میں دوسو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملا جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ بن عمر' جو خود بڑے صاحب علم و افتا تھے' اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: عطا بن ابی رباحؒ کے ہوتے ہوئے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ حضرت عطا بن ابی رباحؒ ۱۱۵ ہجری تک حیات رہے اس تمام عرصے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ جب مدینہ تشریف لاتے تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہو کر مستفید ہوتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ نے حضرت عطاؒ بن ابی رباح کے علاوہ مدینہ کے جن علماء کرام سے حدیث کی سند لی ان میں حضرت عکرمہؒ کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کے غلام اور شاگرد تھے' وہ صاحب اجتہاد اور فتویٰ کے مجاز تھے' انہوں نے بہت سے صحابہ کرام سے' جن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' حضرت عقبہ بن عمر رضی اللہ عنہ' حضرت صفوان رضی اللہ عنہ' حضرت جابر رضی اللہ عنہ' حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور بہت

سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل ہیں، جن سے حدیث سیکھی اور فقہی مسائل کی تحقیق کی۔ کم از کم ستر مشہور تابعین حدیث وتفسیر ان کے شاگرد ہیں۔ امام شعبیؒ کے مطابق عکرمہ سے بڑھ کر قرآن جاننے والا کوئی نہیں امام ابوحنیفہؒ جب جب مکہ و مدینہ تشریف لے جاتے تو حرمین شریف میں مہینوں طویل قیام کرتے تھے کیونکہ ایام حج میں دور دراز ممالکِ اسلامی سے بڑے بڑے اہل علم مکہ آ کر جمع ہوتے تھے۔ امام صاحبؒ ان لوگوں سے ملتے اور علم حاصل کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کا وہ کام جس نے انہیں تمام فقہا میں ممتاز کیا اور عظمت عطا کی وہ تالیف حدیث میں ایک نئی طرز ڈالنے کا ہے۔ انہوں نے عبادات و معاملات کے ابواب کی ایک ترتیب قائم کی اور ہر مسئلے کے متعلق احادیث اس کے باب میں ترتیب وار درج کیں۔ گویا اس کام کے ذریعے انہوں نے علوم الشرعیہ مین جدید ترین اسلوب کی داغ بیل ڈالی۔ اس اسلوب تصنیف کے وہ موجد ہیں۔ علم حدیث میں اُن کی کتاب ''کتاب الاثار'' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ان کے بعد ان کے ہی اس اسلوب پر حضرت امام مالکؒ نے اپنی کتاب ''مؤطا'' کی ترتیب کی۔ دراصل امام صاحب کے اس کام اور ترتیب ابواب و مضامین سے پہلے ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایک تو اُس زمانے میں تصنیف و تالیف کا رواج نہیں تھا۔ وہ زمانہ نہ حفظ روایت اور استنباط (یعنی بات سے بات نکالنے) کا زمانہ تھا۔ اُس دور میں گو کہ حدیث کے بہت سے مجموعے ضبط تحریر میں آئے لیکن ان میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ وہ صرف اس مقصد کے تحت لکھے گئے تھے کہ ان تمام احادیث کو یکجا کر دیا جائے۔ محدث نے اپنے اساتذہ سے جو کچھ جیسے جیسے سنا انہیں ویسے ہی جمع کرتے چلے گئے۔ اگر کسی کو کوئی مسئلہ دیکھنا یا معلوم کرنا ہوتا تو پوری کتاب کو ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام احادیث کو ایک ترتیب اور نظم کے ساتھ درجہ بندی کے ساتھ مرتب کیا۔ یہ اُن کا اتنا بڑا اور عظیم

کام ہے جس نے انہیں اپنے تمام ہم عصروں میں عظمت و عزت کی نمایاں ترین جگہ پر فائز کر دیا اور اس کے بعد اُن کی ہی پیروی و اتباع تمام فقہا و آئمہ نے کی اور اب تک کر رہے ہیں۔ اُن کے علمی کارناموں میں آج تک اُن کا ہم پلہ کوئی دوسرا نہیں ہوا۔

امام ابوحنیفہؒ کے متعلق تمام کتبِ مناقب اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں چند صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے ملاقات اور روایت کا شرف حاصل تھا جو ان کے ہم عصر فقہاء امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ اوزاعیؒ کو بھی حاصل نہ تھا۔ (الخیرات الحسان) امام صاحبؒ نے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ حاصل کئے اور ان کی تتبع و جستجو میں لگے رہتے تھے۔ امام صاحبؒ نے جن صحابہ رضی اللہ عنہ سے فتاویٰ حاصل کئے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بہرہ مند اور اجتہاد و فکر کی دنیا میں مستقل تفکر کے حامل تھے۔ اس بات پر بھی تمام روایت کرنے والے متفق ہیں کہ جو صحابہ کرام پہلی صدی ہجری یا 80 ہجری کے بعد تک زندہ تھے اُن سے امام ابوحنیفہؒ کو شرف ملاقات حاصل ہوا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک متوفی 93ھ' حضرت عبداللہ بن اوفی' حضرت واثلہ بن الاسقع متوفی 85ھ' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت ابوالطفیل' سہل بن ساعد' حضرت عامر بن واثلہ متوفی 102ھ رضوان اللہ اجمعین تھے۔ (المناقب المکی= امام ابوحنیفہؒ عہد و حیات محمد ابو زہرہ مصر)۔ کچھ علماء کی رائے ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی صحابہ کرام سے ملاقات تو ضرور ہوئی مگر انہوں نے ان صحابہ کرام سے کوئی روایت نہیں کی کیونکہ اس وقت تک امام صاحبؒ نہ تو سن شعور کو پہنچے تھے اور نہ ہی انہوں نے تحصیل علم شروع کی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے اپنا آبائی کام ریشمی کپڑے کی تجارت شروع کر دی تھی اور جب انہوں نے تحصیل علم شروع کی تو اپنے ایک معتمد ساتھی جو حصول علم فقہ اور روایت حدیث میں ان کے معاون بھی تھے کو اپنے کاروبار کا منتظم و معاون مقرر کر دیا تھا۔ جو بازار آنے جانے اور لین دین کے معاملات ادا کیا

کرتے اور بازار کے اتار چڑھاؤ سے امام صاحب کو باخبر رکھتے تھے۔ وہ امانت دار تھے اور ان کی طرف سے کاروبار چلایا کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ میں تاجر ہونے کی حیثیت سے چند نمایاں وصف تھے۔جن کا تعلق لوگوں سے تجارتی تعلق اور معاملات سے تھا جس کے باعث وہ تجارت پیشہ افراد میں بھی اسی طرح نمایاں اور ممتاز تھے جیسے علماء کرام کے درمیان وہ امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

امام حنیفہؒ چونکہ دولت مند صاحب ثروت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی طبیعت میں حرص و طمع سے نفرت اور استغنا کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ تنگ دستی وفقر سے ناآشنا تھے۔ امام ابوحنیفہؒ بے انتہا امانت دار اور دیانت دار تھے وہ امانت داری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے نفس پر ہر طرح کی سختی کیا کرتے تھے۔ان کی طبیعت میں سخاوت تھی' بخل سے انہیں نفرت تھی وہ بڑے ہی زاہد و عبادت گزار تھے۔ دن کو روزہ رکھتے اور رات عبادت الٰہی میں گزارتے تھے۔ (محمد ابوزہرہ مصری)

امام ابوحنیفہؒ اپنی تمام تر علمی فقہی مصروفیات کے باوجود اپنے کاروبار کو بھی وقت دیتے تھے۔ وہ اپنے کاروبار سے لاتعلق نہیں رہتے تھے۔ وہ جمعہ کے روز اپنے احباب کی دعوت کیا کرتے تھے اور ہفتے کے روز صبح چاشت کے وقت سے لے کر ظہر تک بازار میں اپنی دکان پر بھی بیٹھتے تھے۔ (المناقب المکی بہ روایت یوسف بن خالد)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کاروباری ایمان داری' دیانت داری کے سلسلے میں المناقب المکی میں دو واقعات نقل ہیں یہ وہ صفات ہیں جن کا مجموعی حیثیت سے ان کے تجارتی معاملات پر گہرا اثر پڑا اور تاجروں میں وہ انوکھی وضع کے تاجر نظر آتے ہیں۔امام صاحبؒ نے اپنے تجارتی معاملات کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تشبیہ دی ہے گویا امام صاحبؒ نے امور تجارت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پیروی کو فوقیت دی۔مکی نے اپنی مناقب

میں ایک واقعہ اس طرح تحریر کیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت ایک تھان ریشمی پارچہ فروخت کرنے کے لیے امام صاحبؒ کے پاس لائی۔ امام صاحبؒ نے اس سے قیمت دریافت کی تو اس نے سو درہم بتائی۔ امام صاحبؒ نے مال دیکھا تو انہیں اندازہ ہوا کہ مال کی قیمت اس عورت کے مطالبے سے کہیں زیادہ ہے اس پر انہوں نے عورت سے کہا کہ یہ مال تو سو سے کہیں زیادہ کا ہے۔ عورت نے سو اور بڑھا دیئے۔ امام صاحبؒ اسی طرح کہتے گئے یہاں تک کہ عورت نے چار سو درہم قیمت پہنچادی۔ امام صاحبؒ نے اس پر بھی فرمایا یہ تو چار سو سے بھی زیادہ کا ہے۔ اس بات پر عورت برہم ہوگئی اور بولی آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس پر امام صاحبؒ نے اس عورت سے کہا کہ کسی اور دکان دار کو بلا لاؤ جو اس کی قیمت لگائے۔ اس پر وہ ایک دوسرے دکاندار کو لے آئی۔ اس نے وہ کپڑا پانچ سو درہم میں خرید لیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ بحیثیت تاجر خریدار ہونے کی صورت میں بھی اپنے نفع کے خیال کے ساتھ ساتھ دوسروں کے نفع ونقصان کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ اور موقع ملنے کے باوجود کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اپنے دوستوں اور نادار افراد سے اپنا تجارتی منافع نہیں لیتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک دوست کو ایک خاص رنگ کے کپڑے کی ضرورت پیش آئی جو امام صاحبؒ کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے دوست کو صبر کا مشورہ دیا کہ اس قسم کا کپڑا آئے گا تو تمہارے لیے خرید لوں گا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مطلوبہ کپڑا آیا امام صاحب نے وہ اپنے دوست کے لیے خرید کر رکھ دیا۔ جب وہ دوست آیا تو نکال کر اسے پیش کر دیا۔ دوست نے دریافت کیا کہ کتنے کا ہے؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: کہ ایک درہم کا۔ دوست کہنے لگا کہ: مجھے آپ کے بارے میں یہ گمان تک نہیں تھا کہ آپ میرا مذاق یوں اڑائیں گے۔ امام صاحبؒ

نے فرمایا کہ: میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے بیس اشرفی اور ایک درہم میں دو کپڑے خریدے تھے۔ ان میں سے ایک کپڑا بیس اشرفی کا فروخت ہو چکا ہے اس لیے یہ ایک ہی درہم میں میرے پاس رہ گیا سو وہی تم کو بتا دیا ہے۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ ایک نادار عورت کا ہے جو کپڑا لینے آپ کی دکان پر آئی تو اس نے کہا: میں نادار ہوں آپ کو یہ کپڑا دیانت داری سے جتنے کا پڑا ہے اتنے ہی میں مجھے دے دیجئے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا چار درہم دے دو۔ اس پر وہ عورت برہم ہوگئی کہ اتنے قیمتی کپڑے کے چار درہم کہیں تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا نہیں، بڑی بی میں نے دو کپڑے خریدے تھے، اس میں سے ایک کپڑا اصل لاگت چار درہم کم میں فروخت ہوا۔ اس لیے یہ کپڑا چار درہم میں ہی پڑا ہے۔ (مناقب المکی)

ایک بار امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شریک کاروبار حفص بن عبدالرحمٰن کو کچھ تجارتی سامان دے کر بھیجا اس میں ایک کپڑا عیب دار تھا۔ آپؒ نے اسے تاکید کی کہ جب یہ کپڑا فروخت کرو تو اس کا عیب کھول کر ضرور بیان کر دینا۔ لیکن حفص نے جب سامان فروخت کیا تو وہ عیب بتانا بھول گیا جب امام صاحبؒ کو معلوم ہوا تو اس سامان کی تمام قیمت صدقہ کر دی۔ (تاریخ بغداد)

امام اعظمؒ اپنی تجارت میں حلال نفع کماتے اور اس نفع کا ایک بڑا حصہ سال بھر جمع کرتے رہتے اور سال پورا ہونے پر اس رقم کو شیوخ اور محدثین کی ضروریات زندگی، ان کی خوراک ولباس اور دوسری چیزوں کی خریداری پر خرچ کیا کرتے تھے اور اگر کچھ اشرفیاں بچ جاتی تھیں تو وہ شیوخ اور محدثین کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے اور ان کو تاکید فرماتے کہ یہ رقم اپنی ضروریات میں خرچ کیجئے اور اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا نہ کیجئے۔ میں نے اپنے مال سے کچھ نہیں دیا یہ سب محض اللہ کا فضل ہے۔ (تاریخ بغداد)

ایک واقعہ الخیرات الحسان میں اس طرح درج ہے کہ ایک بار آپؒ کی مجلس میں ایک شخص بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے آیا اور آپ کا ہم نشین ہو گیا۔ جب محفل ختم ہوئی تو آپؒ نے اس شخص کو مخاطب فرما کر کہا کہ ذرا ٹھہرے رہو جب وہ شخص اکیلا رہ گیا تو آپؒ نے اس سے کہا جائے نماز کو اٹھاؤ اور جو مال اس کے نیچے پڑا ہے لے جاؤ۔ اس شخص نے مصلےٰ اٹھا کر دیکھا تو اس کے نیچے ایک ہزار درہم رکھے ہوئے تھے۔ امام صاحبؒ نے اسے کہا یہ درہم لے جاؤ اور اپنی حالت درست کرو۔ اس شخص نے کہا میں تو خوش حال آدمی ہوں اور اللہ کا دیا بہت کچھ میرے پاس ہے۔ مجھے ان درہموں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس پر حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کیا تم نے یہ حدیث نہیں سنی۔ ''اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کی نعمتوں کا اثر بندے پر نظر آئے۔'' پس تمہیں چاہئے کہ تم اپنی حالت سنوار کر رکھو تا کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے دوست کو صدمہ نہ ہو۔ (الخیرات الحسان)

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے علم حدیث کے حصول کے لیے بے شمار شیوخ سے رجوع کیا ابوحفص کبیرؒ کے دعویٰ کے مطابق امام ابوحنیفہؒ نے کم از کم چار ہزار شخصیتوں سے احادیث روایت کی ہیں۔ علامہ ذہبیؒ نے 'تذکرہ الحفاظ' میں علامہ بن یوسف صالحی دمشقی شافعیؒ نے 'عقود الجمان' میں تین سو انیس نام امام ابوحنیفہ کے اساتذہ کے تحریر کئے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ بغداد' تہذیب الکمال' تہذیب الاسماء واللغات' تذکرہ الحفاظ' ملخص طبقات الحفاظ' تہذیب التہذیب' الانساب سمعانی' موطا امام محمدؒ' کتاب الآثار امام محمد میں امام اعظمؒ کے شیوخ کے اجمالی حالات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی علمی ترقی کا بڑا سبب ان کا بڑے بڑے اہل علم و کمال سے ملاقاتیں اور صحبتیں تھیں جن کے لیے انہیں اکثر سفر کرنا پڑتے تھے۔ علماء کرام سے ملنے اور علمی مجلسوں میں شریک ہونے کا امام صاحبؒ کو بڑا ہی شوق تھا۔

امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے: ''اصل عالم تو وہ ہے جو ہمیشہ طلب علم میں مشغول رہے اور جو شخص یہ سمجھے کہ اب مجھے مزید علم کی ضرورت نہیں وہ عالم نہیں جاہل ہے۔'' امام صاحبؒ نے اپنی زندگی میں روایات کے مطابق پچپن حج کیے وہ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد ہر سال حج کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ امام صاحبؒ حج کے مناسک سے تقویٰ حاصل فرماتے اور دوران سفر دینی علوم حاصل کرنے کا بہترین موقع بھی انہیں ملتا تھا۔ امام صاحبؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ کے علوم نافع مولیٰ ابن عمر سے حاصل کیے اس طرح انہوں نے ایک جانب کوفے کے مدرس کے ذریعے ابن مسعودؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم حاصل کیے دوسری طرف تابعین کی وساطت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ اور اقوال کا ذخیرہ جمع کیا۔

حضرت امام اعظمؒ نے امام زید بن علی زین العابدین رضی اللہ عنہ جو مختلف علوم وفنون اسلامیہ کے ماہر تھے۔ قرآت' علوم قرآنیہ' فقہ' علم عقائد' مقالات اور کلامیہ میں انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ امام صاحبؒ نے تقریباً دو سال ان سے علوم حاصل کیے لیکن ان کی خدمت میں رہ کر باقاعدہ تحصیل علم نہیں کی بلکہ مختلف ملاقاتوں کے دوران ان سے استفادہ کیا۔ علماء نے امام جعفر صادقؒ کو بھی امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ میں شامل کیا ہے گو کہ امام جعفرؒ نہ صرف ان کے ہم عمر تھے بلکہ ہم عصر بھی تھے۔

امام ابوحنیفہؒ نے ہر علم حاصل کیا' اور ہر فن کو اس کے ماہر شخص سے ہی حاصل کیا۔ اگر اس سے اختلاف ہوتا تو وہ اس سے صرف مفید اور کارآمد باتیں حاصل کرلیا کرتے۔ وہ اچھے اور برے خیالات میں بہ خوبی تمیز کرلیتے تھے۔ اچھی بات کو اپنا لیتے اور بری کو چھوڑ دیتے۔ امام صاحبؒ اس سلسلے میں اپنے تمام ہم عصروں سے منفرد تھے۔ امام صاحبؒ نے اعتدال کا مسلک اختیار کیا اور اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کیا۔ امام صاحبؒ نے بحیثیت طالب علم

ہر علمی دروازے پر دستک دی۔ تمام مسالک کی راہ نوردی کی، ہر مسلک کو بغور سمجھا اور دین متین کی کسوٹی پر پرکھا اور پوری طرح جانچ پڑتال کر کے فیصلہ لیا۔ اس قسم کا انتخاب بڑا قوی العقل انسان ہی کر سکتا ہے جس کی فکری سطح نہایت درجہ بلند ہو اور اس کے سامنے کوئی معین راہ ہو بلاشبہ امام اعظم ابو حنیفہؒ تحقیق و تجسس کے معاملے میں اپنے تمام ہم عصروں سے یک سر منفرد تھے۔

امام ابو حنیفہؒ طالبِ علمی کے زمانے سے ہی نظریاتی ذہن کے مالک تھے۔ انہیں ابتدا سے ہی معرکہ آرائی اور مناظروں کا شوق تھا۔ اس زمانے میں بصرہ مناظرات کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ امام صاحبؒ اکثر مناظروں میں حصہ لینے کے لیے بصرہ تشریف لے جاتے۔ وہاں وہ مختلف مذاہب کے فقہی حضرات سے مناظرے کیا کرتے۔ ایک روایت کے مطابق امام صاحبؒ نے اس زمانے میں تقریباً بائیس مختلف فرقوں سے مناظرے کیے اور آخر میں اسلامی عقائد کی حمایت اور مدافعت کے لیے بڑے معرکے کیا کرتے تھے۔ اس معرکہ آرائی نے امام صاحبؒ کی قوت فکر میں جلا پیدا کر دی۔ آپ کا دائرہ علمی وسیع کر دیا۔ دوسرے بار بار مکہ و مدینہ شریف اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کے دوران امام صاحبؒ کو ایسے ایسے مسائلِ فقہ سے واسطہ پڑتا جن سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ دیارِ غیر میں مناظرات میں ایسے ایسے فتاویٰ صحابہ اور وجوہ قیاس سامنے آتے جو اس سے پہلے امام صاحبؒ کے علم میں نہ ہوتے تھے۔ اس طرح انہیں اپنے فتاویٰ پر بھی نظر ثانی کا موقع مل جاتا اور اگر غلطی ظاہر ہو جاتی تو وہ اس کی اصلاح فرما لیتے تھے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا اپنے شاگردوں کو تعلیم دینے کا بھی اپنا اصول تھا چونکہ وہ تاجر کی حیثیت سے مال دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اپنے شاگردوں کا بڑا ہی خیال فرماتے تھے۔ وہ مستحق طلبہ کی مالی امداد و معاونت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی تمام ضروریات کا

خود خیال رکھتے یہاں تک کہ اگر کسی شاگرد کا نکاح ہونا ہوتا اور اس کے پاس اتنی گنجائش نہ ہوتی تو اس کی شادی کا تمام خرچہ خود کیا کرتے تھے۔ اپنے تمام شاگردوں کی حسب ضرورت مدد فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ یکسو ہو کر اپنی دنیاوی ضروریات اور پیٹ کے دھندے سے بے نیاز ہو کر اپنی تعلیم سے فارغ ہو سکیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ اپنے شاگردوں کے اہل و عیال کے جملہ اخراجات اپنے ذمے لے لیتے جب شاگرد تعلیم سے فارغ ہو جاتا تو پھر اس سے فرماتے کہ اب تم نے حلال و حرام کے احکام کو سمجھ لیا ہے اس پر عمل کرنا تمہارا فرض ہے۔

امام صاحبؒ اپنے شاگردوں کی علمی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا بھی خیال رکھتے تھے تاکہ کسی طالب علم میں علم کا گھمنڈ اور احساس برتری نہ پیدا ہو۔ اگر ایسا کبھی ہوتا تو آپؒ اس شاگرد کا مختلف طریقوں سے امتحان لینا شروع کر دیتے یہاں تک کہ اسے اپنی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جاتا اور وہ راہِ راست اختیار کر لیتا۔ امام صاحبؒ کو اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا تعلق خاص ہوتا تھا کہ کوئی غلط فہمی کے باعث احساس برتری کا شکار ہو جاتا تو آپؒ اس کا پوری طرح نفسیاتی علاج فرماتے تاکہ وہ اپنی تصحیح و تکمیل علم پوری طرح کر سکے جب آپؒ اپنے شاگرد کی علمی استعداد سے مطمئن ہو جاتے تو اسے سند فراغت عطا فرماتے اور نصیحت فرماتے کہ "تم میرے غم کی دوا اور دل کی مسرت ہو۔"

امام ابوحنیفہؒ کا صرف ایک بیٹا ہوا جس کا نام انہوں نے اپنے استاد کے نام نامی پر حمادؒ رکھا۔ حمادؒ بھی اپنے والد بزرگوار کی مانند بڑے رتبے کے حامل تھے۔ امام صاحبؒ نے ان کی تعلیم کا خصوصی انتظام فرمایا تھا اور خود ان کی تعلیم کی نگرانی فرمایا کرتے۔ حماد علم و فضل کے ساتھ ساتھ بے نیازی و پرہیزگاری میں اپنے والد امام ابوحنیفہؒ کے جانشین تھے۔ حمادؒ کے چار بیٹے تھے۔ جن کے نام عمر، اسماعیل، ابوحیان اور عثمان تھے۔ ان میں اسماعیلؒ نے علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا۔ مامون الرشید نے انہیں عہدہ قضاء پر مامور کیا جس کو انہوں نے پوری دیانت

داری اور انصاف سے انجام دیا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حسن سیرت کے ساتھ ساتھ خوب صورتی سے بھی خوب نوازا تھا۔ آپؒ کا قد درمیانہ تھا' قامت خوشرو اور موزوں اندام تھے۔ گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاف تھی۔ آپؒ کو خوش لباسی کا ذوق تھا۔ آپؒ عمدہ اور خوش نما پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے۔ اکثر چار پانچ سو درہم مالیت کی قمیض پہنا کرتے تھے۔ آپؒ کی فیاضی کا بھی عجیب عالم تھا۔ علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ کسی بیمار کی عیادت کے لیے جا رہے تھے کہ راہ میں انہیں ایک شخص نظر آیا جو ان کا مقروض تھا۔ اس نے دور سے ہی امام صاحبؒ کو دیکھ کر راستہ بدلنے کے لیے کترانے کی کوشش کی اور دوسری طرف چل دیا۔ آپؒ نے اسے پکارا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ قریب جا کر پوچھا کہ تم مجھے دیکھ کر راستہ کیوں بدل رہے تھے۔ اس نے بڑی شرمساری سے کہا کہ حضرت آپ کے دس ہزار درہم کا میں مقروض ہوں جو اب تک ادا نہیں کر سکا اس لیے شرم کے باعث آپ سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ امام صاحبؒ نے اس کی غیرت سے متاثر ہو کر فرمایا جاؤ میں نے سب قرض معاف کر دیا۔'' (تہذیب الاسماء علامہ نووی)

ایک بار امام ابوحنیفہؒ سفر حج پر جا رہے تھے کہ ایک جگہ عبداللہ سہمی کو کسی بدو نے پکڑا اور امام صاحبؒ کے پاس لایا اور ان سے کہا کہ یہ میرا قرض دار ہے جو یہ ادا نہیں کر رہا۔ امام صاحبؒ نے عبداللہ سہمی سے حقیقت حال معلوم کی تو انہوں نے قطعی انکار کر دیا۔ امام صاحبؒ نے بدو سے دریافت کیا کہ تمہارا کتنے درہم کا دعویٰ ہے۔ بدو نے کہا چالیس درہم۔ امام صاحبؒ نے حیرت کا اظہار کیا اور چالیس درہم اپنے پاس سے بدو کو ادا کر دیئے۔ ایک اور ایسا ہی واقعہ ابراہیم بن عتبہ کے بارے میں ہے کہ وہ کسی کے چار ہزار درہم کے مقروض تھے جس کی وجہ سے وہ ندامت کے مارے کہیں آتے جاتے نہیں تھے اور دوست احباب تک سے ملنا

چھوڑ دیا تھا۔ ان کے ایک دوست نے ان کا قرضہ ادا کرنے کے لیے اپنے احباب سے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ وہ امام صاحبؒ کی خدمت میں بھی آئے تو امام ابوحنیفہؒ نے دریافت کیا کہ کل قرضہ کس قدر ہے؟ تو انہوں نے کہا حضرت چار ہزار درہم اس پر آپؒ نے فرمایا بس اتنی سی رقم کے لیے تم لوگوں کو تکلیف دے رہے ہو۔ یہ کہہ کر امام ابوحنیفہؒ نے چار ہزار درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔ (تہذیب الاسماء)

امام صاحبؒ دولت مندی اور عظمت شان کے ساتھ ساتھ حلیم و خلیق اور متواضع انسان تھے۔ وہ طیش میں نہیں آتے تھے اور اپنے ارادت مندوں اور شاگردوں کو بھی صبر وضبط اور تحمل کا درس دیتے تھے اکثر دوران درس کسی دوسرے امام و فقیہہ کا ارادت مند کسی بات پر برہم ہو کر بدکلامی و بدگوئی پر اتر آتا اور آپؒ کے شاگرد اور حاضرین مجلس چاہتے کہ اس کی سرکوبی کریں تو امام صاحبؒ انہیں سختی سے روک دیا کرتے تھے۔ یزید بن کمیت کہتے ہیں کہ ایک بار امام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص نے گستاخانہ گفتگو شروع کر دی۔ امام صاحبؒ بڑے تحمل سے جواب دیتے رہے لیکن وہ شخص جری ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس نے امام صاحبؒ کو زندیق کہہ دیا۔ اس پر امام صاحبؒ نے بڑے صبر و تحمل سے فرمایا۔ اللہ تمہیں بخشے وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت تم نے جو لفظ کہا وہ درست نہیں۔ امام صاحبؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی کسی پر لعنت نہیں کی، کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا کسی سے کبھی فریب اور بدعہدی نہیں کی۔ آپؒ کے ہمسائے میں ایک رنگین مزاج موچی رہتا تھا جو دن بھر تو محنت مزدوری کیا کرتا اور شام کو بازار سے گوشت اور شراب خرید لاتا۔ رات کو اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سیخ پر کباب بنا بنا کر اپنے دوستوں کی تواضع شراب و کباب سے کیا کرتا اور نشے کی ترنگ میں وہ گانے لگتا ''لوگوں نے مجھ کو کھو دیا، اور کیسے بڑے شخص کو کھو دیا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا۔'' رات کا وہ پہر امام صاحبؒ کے

ذکرواذکار اور عبادت کا ہوا کرتا۔ امام صاحبؒ کے کانوں تک اس گانے کی آوازیں آتی تھیں لیکن وہ اپنے اخلاق اور تحمل مزاجی کے باعث خاموش رہتے۔ اور کبھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایک رات کوتوالِ شہر گشت پر تھا۔ وہ جب ادھر سے گزرا تو اس نے موچی کو بھی پکڑ کر قید کر دیا۔ دوسرے دن جب اس کی آوازیں امام صاحبؒ کو نہ سنائی دیں تو صبح انہوں نے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ رات ہمارے ہمسائے کی آواز نہیں آئی۔ خیریت تو ہے۔ اس پر اہلِ محلہ نے بتایا کہ اسے کوتوالِ شہر پکڑ کر لے گیا۔ آپؒ نے اسی وقت دربار میں حاضری والے کپڑے زیب تن کیے اور دارالامارت پہنچ گئے۔ کوفہ کے گورنر عیسیٰ بن موسیٰ کو جب اطلاع ہوئی کہ امام ابوحنیفہؒ ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں تو اس نے فوراً ہی اپنے درباریوں کو امام صاحبؒ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ امام صاحبؒ کو بڑی عزت واحترام سے اپنے قریب بٹھایا۔ اس نے دریافت کیا حضرت آپ نے کیوں تکلیف فرمائی مجھ کو بلا بھیجا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا ہمارے محلے میں ایک موچی رہتا ہے کوتوال نے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا ہو جائے۔ گورنر عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو حکم بھیج دیا کہ موچی کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ امام صاحبؒ جب گورنر سے رخصت ہو کر چلے تو موچی بھی ساتھ ہولیا تو امام صاحبؒ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کہو ہم نے تمہیں ضائع تو نہیں کیا۔'' امام صاحبؒ نے اس شعر کی طرف اشارہ کیا تھا جو وہ نشے کے عالم میں گایا کرتا تھا۔ اس نے عرض کیا نہیں آپ نے ہمسائیگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ امام صاحبؒ کے اس عمل سے وہ شخص اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تمام عیش پرستی سے توبہ کر لی اور امام صاحبؒ کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگا اور رفتہ رفتہ علم وفقہ میں مہارت حاصل کر لی اور فقیہہ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ (الاغانی' ابن خلکان' عقود الجمان)

آپؒ میں عقل ورائے سے استصواب کرنے' احکام شرعیہ کو عملی زندگی میں جاری

کرنے اور جدید مسائل میں قیاس و استحسان سے کام لینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ اسی لیے آپؒ کے طریقے کا نام اہل الرائے مشہور ہو گیا۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ ہمارا علم رائے ہے اور یہی میرے نزدیک سب سے بہتر ہے۔ جو شخص اس کے سوا کسی اور رائے کو بہتر سمجھے اُس کی رائے ہماری رائے ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے نہایت ہی فرماں بردار اور اطاعت گزار تھے۔ وہ واعظوں اور قصہ گو کی نہایت معتقد تھیں' ایک واعظ عمرو بن زرقہؒ سے وہ نہایت متاثر تھیں اور اس سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ جب کبھی انہیں کوئی مسئلہ پیش آتا وہ امامؒ کو حکم دیتیں کہ عمرو بن زرقہ سے پوچھ آؤ۔ امام صاحبؒ تعمیل ارشاد میں مسئلہ پوچھنے چلے جاتے۔ عمرو بن زرقہ آپؒ سے کہتے کہ حضرت آپ کے سامنے میں کیا زبان کھول سکتا ہوں۔ آپ تو خود بڑے جید عالم ہیں۔ امام صاحبؒ فرماتے۔ ''والدہ کا یہی حکم ہے۔'' اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو مسئلے کا حل نہ آتا' وہ امام صاحبؒ سے درخواست کرتا کہ آپ مجھے بتا دیجئے میں اسی کو دہرا دوں گا۔ جب کبھی امام صاحبؒ کی والدہ محترمہ جواب سے مطمئن نہ ہوتیں تو اصرار کرتیں کہ مجھے لے کر چلو میں خود پوچھوں گی۔ امام صاحبؒ والدہ کو سواری پر بٹھاتے اور خود ساتھ پیدل چلتے۔ جب والدہ صاحبہ عمرو سے خود مسئلے کو بیان کر کے اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں تو مطمئن ہو جاتیں۔ ایک بار کسی مسئلے پر امام صاحبؒ نے اپنی رائے دے دی بولیں مجھے تجھ پر اعتبار نہیں۔ امام صاحبؒ انہیں زرقہ کے پاس لے آئے تو والدہ نے مسئلہ پیش کیا تو زرقہ نے کہا امام صاحب آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں آپؒ کیوں نہیں بتا دیتے۔ امام صاحبؒ نے کہا میں نے فتویٰ بتایا تھا جب زرقہ نے کہا بالکل درست فرمایا یہ سن کر والدہ محترمہ کو اطمینان ہوا اور گھر واپس آ گئیں۔ (سیرۃ نعمان۔ شبلی نعمانی)

امام صاحبؒ بہت ہی رقیق القلب تھے۔ کسی کو تکلیف یا رنج میں دیکھتے تو بے چین

وبے تاب ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپؒ مسجد میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے کسی کے چھت سے گرنے کی اطلاع دی اور آپؒ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور آپؒ فوراً ہی اٹھ کر برہنہ پاؤں اس شخص کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ اس جگہ پہنچ کر اس شخص سے ہمدردی کا اظہار کیا اس کی خیریت دریافت کی اور جب تک وہ شخص تکلیف میں رہا امام صاحبؒ ہر روز صبح اس کی خیریت معلوم کرتے اس کی تیمارداری کیا کرتے۔

امام صاحبؒ بڑے ہی زاہد صاحب ریاضت ذکر و عبادت میں مشغول رہنے والے شخص تھے۔ بڑے ذوق و شوق سے وہ اپنے معمولات میں مشغول رہا کرتے تھے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی پرہیزگاری اور عبادت کے اوقات تواتر کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ اکثر نماز کے دوران یا قرآن پڑھتے وقت آپؒ پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ گھنٹوں رویا کرتے تھے۔ حضرت امام بصریؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ شریک تھا۔ انہوں نے نماز میں یہ آیت پڑھی "ولا تحسبن الله غافلا عما يعمل الظالمون "یعنی اللہ کو ظالموں کے کردار سے بے خبر نہ سمجھنا۔" امام ابو حنیفہؒ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ یزید بن کمیتؒ جو امام صاحبؒ کے ہم عصر اور اپنے وقت کے مشہور عابد تھے سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ عشاء کی نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ شریک تھا امام صاحب نے "سورۂ اذا زلزلت" پڑھی لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے میں کھڑا رہا۔ امام صاحبؒ کو دیکھا تو وہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں' میں اٹھ کر چلا آیا کہ ان کے معمول میں خلل نہ ہو صبح مسجد گیا تو دیکھا وہ غم زدہ بیٹھے اپنی داڑھی کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے بڑی رقت سے کہہ رہے تھے "اے وہ ذات جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دے گی اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچانا۔"

ایک روایت مسعر بن کدامؒ سے ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز بازار میں امام

ابو حنیفہؒ چلے جا رہے تھے کہ ان کا پیر ایک لڑکے کے پاؤں پر پڑ گیا وہ لڑکا چیخ اٹھا اور کہا۔

''کیا تو خدا سے نہیں ڈرتا؟'' یہ بات سنتے ہی امام ابو حنیفہؒ کو غش آ گیا جب کچھ دیر بعد ہوش میں آئے تو میں نے پوچھا کہ لڑکے کی بات پر اس قدر بے قرار ہونا کیا معنی ہے؟ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا: کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔ (سیرۃ نعمان عقود الجمان)

ایک دفعہ امام صاحبؒ حسب معمول اپنی دوکان پر گئے تو نوکر کپڑے کے تھان نکال کر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اللہ ہم کو جنت دے۔'' امام کا اتنا سننا تھا کہ ان پر رقت طاری ہو گئی۔ آپؒ اس قدر روئے کہ آپؒ کے شانے تر ہو گئے۔ نوکر کو دکان بند کرنے کی ہدایت دے کر آپؒ دکان سے نکل گئے۔ دوسرے دن نوکر سے کہا: بھائی' ہم اس قابل کہاں کہ جنت کی آرزو کریں۔ یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن اگر مجھ سے مواخذہ نہ ہو اور نہ انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں۔ (سیرۃ نعمان)

امام صاحب کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے اور فتاویٰ کے جوابات دیتے اور تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی۔ نماز ظہر پڑھ کر گھر چلے جاتے۔ گرمیوں میں ظہر کے بعد آرام فرماتے اور سو جاتے۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر درس و تدریس و تعلیم کا سلسلہ چلتا پھر کچھ دوستوں سے ملنے ملانے اور بیماروں کی عیادت کرنے اور غریبوں کی خبر گیری فرماتے۔ نماز مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو عشاء کی نماز تک رہتا تھا۔ نماز عشا پڑھ کر امام ابو حنیفہؒ عبادات میں مشغول ہو جاتے جو اکثر رات بھر رہتا۔ (عقود الجمان)

امام اعظمؒ کے ہم عصر محمد انصاریؒ کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ کی ایک ایک حرکت یہاں تک کہ بات چیت' اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے میں دانش مندی کا نمایاں اثر پایا جاتا تھا۔ امام صاحبؒ کے مشہور اوصاف میں رائے' تدبیر عقل و فراست' ذہانت اور طباعی شامل تھے۔

امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ صرف صحیح حدیث لیتے تھے جو نہایت ثقہ راویوں سے روایت ہوتی۔ امام صاحبؒ کو ناسخ و منسوخ کی بہت پہچان تھی اس کے باوجود وہ پوری تحقیق کیا کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری فعل کی جستجو کریں اور عام علماء کی رائے کا بھی خیال کریں۔ (الخیرات الحسان) امام ابوحنیفہؒ ہمیشہ ان ہی احادیث کو لیتے تھے جنہیں وہ درست اور صحیح سمجھتے تھے اکثر وہ آخری زمانے کی احادیث کو لیتے جن کے راویان صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو روایت کیے زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہوتا تھا۔

حضرت ابونعیمؒ نے ''حلیہ'' میں بخاری اور مسلم نے دوسری سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر ایمان ثریا ستارہ کے پاس بھی ہو اور اہلِ عرب اس کو نہ پا سکتے ہوں تو بھی اس کو ایک فارسی آدمی پالے گا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کی بابت یہ بنیادی اور صحیح بات ہے۔ فارس سے مراد ایران ہے کوئی خاص شہر نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے دادا فارس کے ہی تھے۔ ائمہ اربعہ میں تین ائمہ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ تینوں عرب قبائل سے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہؒ ہی فارسی ہیں اس لیے یہ بشارت ان پر صادق آتی ہے۔ محدث شیرازیؒ اور ابونعیمؒ کے الفاظ اس حدیث کے بارے میں اس طرح ہیں۔ ''کہ اگر علم ثریا ستارے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہو تو اہل فارس کے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی اتار لائیں گے۔ امام طبرانیؒ نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے جو روایت کی ہے وہ اس طرح ہے کہ عرب اس کو نہیں اتار سکیں گے بلکہ فارس کے کچھ لوگ اس علم کو اتار لائیں گے۔ اور امام مسلمؒ کے الفاظ میں اس طرح ہے'' کہ اگر ایمان ثریا ستارے

کے پاس ہوتو بھی اہل فارس کے کچھ لوگ اس کو کھینچ لائیں گے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "خوش خبری ہے ان کے لیے جنہوں نے مجھے دیکھا (یعنی صحابہ) اور جنہوں نے میرے دیکھنے والوں کو دیکھا۔ وہ تابعین اور جنہوں نے تابعین کو دیکھا وہ تبع تابعین ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر اس سے متصل زمانے کے پھر جو اس سے متصل زمانے کے ہوں۔ مسلم شریف کی ایک روایت ہے کہ بہتر لوگ اس صدی کے ہیں جس میں میں موجود ہوں پھر اس سے متصل پھر جو اس سے متصل ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی روشنی میں امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے بھی ملاقاتیں کیں اور احادیث روایت کی ہیں یعنی ان سے علم حاصل کیا ہے۔ اس طرح وہ خود تابعینؒ میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کی پیدائش بھی اسی صدی میں ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اس طرح دونوں خوش خبریاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں امام ابوحنیفہؒ ان پر پورے اترتے تھے۔

آپؒ کے بارے میں محدث حضرت عمرو بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہؒ خلیفہ منصور کے پاس کسی کام سے تشریف لے گئے تو اس کے قاضی موسیٰ بن عیسیٰ نے امام ابوحنیفہؒ کا تعارف کراتے ہوئے خلیفہ منصور سے کہا۔ "اے امیر المومنین یہ آج دنیا میں سب سے بڑے عالم شمار ہوتے ہیں۔" اس پر خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا کہ آپ نے علم کن کن لوگوں سے حاصل کیا ہے؟ تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ "میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے۔ یہ سن کر خلیفہ منصور نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "واہ واہ آپ نے تو اپنے لیے خوب مضبوط علم حاصل کیا ہے۔"

علامہ جلال الدین سیوطیؒ اپنی کتاب ''تبییض الصحیفہ'' میں تحریر کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ؒ کے بارے میں امام ابومعشر عبدالکریم بن عبدالصمد طبریؒ نے ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے کہ ابوحنیفہؒ نے کن کن صحابہ سے روایات بیان کی ہیں اور کتنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ملاقات کی ہے۔ وہ کل سات ہیں۔

(۱) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

(۲) حضرت عبداللہ بن جزء الزبیدی رضی اللہ عنہ

(۳) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

(۴) حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ

(۵) واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ

(۶) حضرت عائشہ بنت عجرد رضی اللہ عنہا

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ذکر تو سات صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کا کیا لیکن نام صرف چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے دیئے ہیں۔ لیکن جس ترتیب سے انہوں نے روایات بیان کی ہیں اس میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث روایت کی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی روایات کو علامہ سیوطیؒ نے اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے امام ابوحنیفہؒ نے تین احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن جزء رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث' حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے دو حدیثیں' حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث' حضرت عائشہ بنت عجرد رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تقویٰ ائمہ کرام کی نظر میں

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں آئمہ کرام جو ان کے دور میں یا ان کے بعد کے دور میں بڑی اہمیت اور شہرت کے حامل تھے ان کی نظر میں امام ابوحنیفہؒ کی کیا اہمیت وحیثیت تھی ان کی رائے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کیا تھی؟

حبان بن موسیٰؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے سنا کہ جب میں کوفہ آیا تو میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سب سے بڑا پرہیزگار کون شخص ہے، تو سب نے ایک ہی جواب دیا کہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

مکی بن ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ میں کوفیوں کی مجلس میں بیٹھا مگر امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ متقی کسی اور کو نہ پایا۔

علی بن حفصؒ فرماتے ہیں حفص بن عبدالرحمنؒ امام ابوحنیفہؒ کے کاروباری شریک تھے۔ ایک بار امام صاحبؒ نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہاتھ کچھ تجارتی سامان بھیجا اور یہ بھی بتا دیا کہ فلاں فلاں کپڑے میں اس طرح کا عیب ہے۔ فروخت کرتے وقت گاہک کو ضرور بتا دیا جائے۔ حفصؒ نے وہ تمام سامان فروخت کر دیا لیکن گاہک کو وہ عیب بتانا بھول گئے۔ جب امام ابوحنیفہؒ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اس مال کی ساری رقم صدقہ کر دی۔

حامد بن آدمؒ یہ فرماتے تھے کہ میں نے عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ کہتے سنا کہ امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ پرہیزگار میں نے نہیں دیکھا۔

یزید بن ہارونؒ امام ابوحنیفہؒ کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے تمام لوگوں سے زیادہ

عقل منداور نہایت پرہیزگار سوائے امام ابوحنیفہؒ کے کسی اور کو نہیں دیکھا۔

محمد بن عبداللہؒ کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کے چلنے، بات چیت کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور اندر باہر آنے جانے سے عقل ٹپکتی تھی۔

حجر بن عبدالجبارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مجلس کا، شاگردوں کا اکرام کرنے والا امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

ابن مبارکؒ مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں، میں نے ابوحنیفہؒ کو شرافت، عزت، بھلائی میں روزانہ بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ بات بالکل صحیح کرتے ہیں اگر کوئی ظالم بدگو، ظلم و بدگوئی کرے تو ان کی فقیہانہ باتیں اس کو خاموش کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی ان سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ عقل مندی سے سبقت لے جاتے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ کوئی ان سے مقابلہ کر سکے۔ ابوحنیفہؒ کے پاس جب کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو اس کے علم کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سامنے آ جاتا تھا۔ ایسے مشکل مسائل جس کے سامنے بڑے بڑے علماء نہ ٹھہر سکتے تھے مگر امام صاحبؒ ان پر بھرپور بصیرت رکھتے تھے۔ (تبیض الصحیفہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ)

فضیل بن عیاضؒ سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فقہ میں بہت بڑے فقیہہ مشہور تھے اسی طرح وہ پرہیزگاری میں بھی معروف و مال دار تھے۔ مہمانوں پر بڑے ہی مہربان تھے۔ تعلیم و حصول علم میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ رات میں عبادت کیا کرتے تھے۔ خاموش رہتے، کم بولتے تھے، جب کوئی مسئلہ پیش آتا جو حرام و حلال کا ہوتا تو حق بات کو بہترین انداز سے پیش کرتے تھے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو فقہ سیکھنی ہے تو ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کو لازم پکڑے کیونکہ فقہ میں سارے ہی لوگ ان کے محتاج ہیں۔

امام وکیعؒ فرماتے ہیں۔ اللہ کی قسم امام ابوحنیفہؒ بڑے امانت دار تھے اور اُن کے دل

میں اللہ جل شانہ کی کبریائی وعظمت شان گھر کر گئی تھی۔ اللہ کی رضا کو ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے۔ اگر اللہ کی خاطر تلوار بھی برداشت کرنی پڑتی تو کرتے وہ ان بندوں میں سے تھے جن سے اللہ راضی ہوا۔

خلف بن ایوبؒ نے فرمایا کہ علم اللہ کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ ان سے ان کے صحابہ تک اور ان سے تابعین تک پہنچا اور پھر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں تک۔

خضر بن شمیلؒ فرماتے ہیں کہ لوگ فقہ سے غافل اور سوئے ہوئے تھے یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے انہیں جگایا۔ فقہ کو کھولا اور بیان کیا اور خالص کیا۔

ابونعیمؒ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ حسین چہرے والے اچھے کپڑے اچھی خوش بو اور اچھی مجلس والے تھے۔ انتہائی اکرام کرنے والے اور مسلمان بھائیوں سے اچھا میل جول رکھتے تھے۔

ابن مبارکؒ جب معمرؒ کے پاس آئے تو وہ فرمانے لگے میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقہ میں بات کرنے والا، سمجھنے والا اور حدیث کی بہترین شرح فقہی لحاظ سے کرنے والا کسی اور کو نہیں پایا اور نہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ احتیاط کرنے والا اور ڈرنے والا اس بات سے کہ کہیں اللہ کے دین میں شک کی بنا پر کچھ بڑھا دے۔ ایک اور جگہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ سے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ غیبت سے بہت دور رہتے ہیں میں نے کبھی ان کو دشمن کی بھی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ اس پر حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا خدا کی قسم وہ بڑے ہی عقل مند ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ان کی نیکیاں کوئی دوسرا لے جائے۔ ایک اور جگہ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بن عمارہؒ کو دیکھا کہ وہ امام کی سواری پکڑے کہہ رہے ہیں اللہ کی قسم آپ سے زیادہ فقیہہ اور حاضر جواب ہم نے نہیں پایا۔ آپ اپنے وقت کے ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر عیب سے بری ہیں۔ بلکہ آپ تو سردار ہیں

آپ کے خلاف زبان درازی صرف حاسدین ہی کر سکتے ہیں۔

مسعر بن کدامؒ فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہؒ کی مسجد میں آیا تو دیکھا کہ وہ صبح کی نماز پڑھ کر لوگوں کے لیے علمی مجلس میں بیٹھ گئے۔ ظہر کی نماز تک پھر عصر کی نماز تک پھر عصر کی نماز پڑھ کر مغرب تک پھر عشاء کی نماز تک میں نے کہا یہ شخص نفلی عبادت کے لیے کب فارغ ہوگا؟ پھر میں نے کہا کہ آج رات میں طاق میں بیٹھ کر دیکھوں گا کہ یہ کیا کرتا ہے؟ میں بیٹھا رہا جب سناٹا چھا گیا اور لوگ سو گئے تو امام ابوحنیفہؒ مسجد کی طرف نکلے اور صبح طلوع ہونے تک نوافل ادا کرتے رہے پھر گھر تشریف لے گئے۔ کپڑے بدلے پھر مسجد تشریف لائے۔ صبح کی نماز پڑھی اور علمی مجلس میں بیٹھ گئے اور درس کا سلسلہ شروع کر دیا پھر ظہر سے عصر' عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء کی نماز تک یہی سلسلہ جاری رکھا۔ میں پھر طاق میں بیٹھ گیا کہ شاید آج رات امام صاحبؒ آرام کریں لیکن رات جب گہری ہوگئی لوگ سو گئے تو امام صاحبؒ حسب سابق مسجد میں کل کی طرح مصروف عبادت ہو گئے اور میں نے کئی دن اسی طرح امام صاحبؒ کی مصروفیات دیکھتے گزار دیئے لیکن ان کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں دیکھ سکا۔ پھر میں نے پکا عہد کر لیا کہ میں ان کی مجلس میں ہمیشہ رہوں گا۔ یہاں تک کہ یا تو یہ وفات پائیں یا مجھے موت آ جائے۔ ابن ابی معاذؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ خبر پہنچی کہ مسعرؒ مسجد ابوحنیفہؒ میں سجدہ کی حالت میں وفات پا گئے۔ (تبییض الصحیفہ)

جویریہؒ نے کہا کہ میں نے حماد بن ابی سلیمانؒ علقمہ بن مرثدؒ محارب بن دثار' عون بن عبداللہؒ کے ساتھ وقت گزارا' اور امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ بھی رہا مگر ان سب میں امام ابوحنیفہؒ سے رات کو اچھی عبادت کرنے والا کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں نے چھ مہینے تک انہیں کسی رات مسجد میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھا۔ (تبییض الصحیفہ)

ابی بکر بن عیاشؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سفیانؒ کے بھائی عمر بن سعیدؒ فوت

ہوئے تو ہم تعزیت کے لیے آئے۔ مجلس بھری ہوئی تھی ان میں حضرت عبداللہ ادریسؒ بھی تھے۔ اتنے میں امام ابوحنیفہؒ اپنے اصحاب کے ساتھ آتے دکھائی دیئے جب حضرت سفیانؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور ان سے معانقہ کیا اور انہیں اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود سامنے بیٹھ گئے۔ اس پر میں نے عرض کیا حضرت آپ نے آج ایسا کام کیا جس کو میں اور میرے ساتھی پسند نہیں کرتے۔ حضرت سفیانؒ نے دریافت کیا' آخر ایسا وہ کون سا کام ہے؟ میں نے عرض کیا جب امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو آپ نے انہیں اپنی جگہ بٹھا دیا اور ان کے احترام میں کھڑے تک ہو گئے۔ اس پر حضرت سفیانؒ نے فرمایا کہ تجھے یہ بات ناپسند کیوں ہے؟ وہ شخص علم کے اس مرتبے و مقام پر ہے کہ اس کے علم کی وجہ سے کھڑا ہونا ہی ضروری تھا اگر میں اس کے علم کی وجہ سے کھڑا نہ ہوتا تو ان کی عمر کے لحاظ سے کھڑا ہوتا اور اگر میں ان کی عمر میں بڑا ہونے کا خیال نہ کرتا تو ان کی فقاہت کی وجہ سے کھڑا ہوتا اور اگر میں فقاہت کا خیال نہ کرتا تو ان کے تقویٰ کی وجہ سے کھڑا ہوتا۔ یہ بات سن کر میں شرمندہ ہو گیا اور میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

علی بن یزیدؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو دیکھا کہ وہ رمضان شریف میں ساٹھ قرآن ختم کرتے تھے یعنی ایک دن میں اور ایک رات میں۔

ابی یحیٰ حمانیؒ امام ابوحنیفہؒ کے بعض شاگردوں سے روایت کرتے ہیں کہ امام صاحبؒ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے اور امام صاحبؒ جب رات کی نماز کا اہتمام کرتے تو عمدہ لباس زیب تن کرتے عمدہ خوش بو لگاتے سر اور داڑھی میں کنگھی کرتے۔

حضرت شقیق بن عتیبہؒ کا قول ہے حضرت سفیانؒ نے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میری آنکھ نے امام ابوحنیفہ جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔

(حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ' سیرۃ النعمان کامل میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے

تذکرہ نویسوں نے امام صاحب کے اخلاق و عادات کی جو تصاویر کھینچی ہیں اس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا رنگ اس قدر بھر دیا ہے کہ امام صاحب کی اصل صورت پہچانی نہیں جاتی۔)

حضرت حماد بن سلمہؒ کا قول عفان بن مسلمؒ نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ سب سے اچھا فتویٰ دینے والے تھے۔

حضرت یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ میں آرزو کرتا ہوں کہ میں امام ابو حنیفہؒ سے اتنا اتنا علم لکھ لیتا۔

حضرت علی بن عاصمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی عقل کو نصف اہل زمین کی عقلوں سے وزن کیا جائے تو ان کی عقل بڑھ جائے گی۔

حضرت نعیم بن عمرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے سنا۔ فرماتے تھے لوگوں پر تعجب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میں قیاس سے فتویٰ دیتا ہوں۔ لیکن میں نے کبھی اثر کے بعد فتویٰ نہیں دیا۔ (اثر سے مراد حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین ہیں)

حضرت اسد بن عمرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ قرآن کی کوئی سورۃ ایسی نہیں جس کو میں نے وتروں میں نہ پڑھا ہو۔

حضرت یحیٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآت حمزہؒ کی افضل ہے اور فقہ امام ابو حنیفہؒ کا افضل ہے اسی پر میں نے لوگوں کو پایا ہے۔

حضرت جعفر بن ربیعؒ کہتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پانچ سال رہا میں نے ان سے زیادہ خاموش طبیعت کوئی اور نہیں دیکھا' جب ان سے کسی فقہی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا تو کھل پڑتے اور ایسے بہتے جیسے وادی میں پانی بہتا ہے۔ کبھی وہ آہستہ آواز میں اور کبھی بلند آواز میں بولتے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے علم شریعت کو مرتب نہیں کیا تھا اور نہ ان کے ابواب کی ترتیب کی تھی اور نہ ہی کوئی کتاب مرتب کی تھی وہ صرف اپنی قوت حافظہ پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے علمِ دین کو منتشر دیکھا تو ضائع ہونے کا خوف محسوس کیا تو انہوں نے اسے مدوّن کیا اور اس کے ابواب کی ترتیب دی۔ سب سے پہلے کتاب الطہارت پھر کتاب الصلوٰۃ پھر تمام عبادات و معاملات اور آخر میں کتاب المواریث کو رکھا۔ طہارت اور نماز سے انہوں نے ابتدا اس لیے کی کہ یہ اہم ترین عبادات میں سے ہیں اور کتاب المواریث کو آخر میں اس لیے رکھا کہ انسانوں کی آخری حالت یہی ہوتی ہے اور امام ابوحنیفہؒ ہی نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط لکھی اس لیے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سارے ہی لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں۔

امام شافعیؒ سے حرملہ نے روایت کی کہ جو شخص فقہ میں کامل بننا چاہے وہ ابوحنیفہؒ کے عیال میں شامل ہو جائے' کیونکہ فقہ ان کے موافق کر دی گئی ہے' ایک اور جگہ امام شافعیؒ سے ربیعؒ روایت کرتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں' میں نے ان سے زیادہ فقیہہ کسی کو نہیں دیکھا۔ جس نے امام ابوحنیفہؒ کی کتب کا مطالعہ نہیں کیا وہ علم میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی دین میں سمجھ بوجھ حاصل کر سکتا ہے۔

(امام شافعیؒ نے جس طرح امام صاحبؒ کی شان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اس سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امام شافعیؒ خود امام ابوحنیفہؒ کی تقلید و پیروی کرتے۔ لیکن ایسا اس لیے نہیں ہو سکا کہ امام شافعیؒ ان کے علم' ان کی ذہانت' ان کی حاضر جوابی' ان کی قوت استدلال سے متاثر تھے لیکن قرآن کی نص کی تشریح اور استنباط میں وہ اپنی رائے اور راہ چونکہ الگ رکھتے تھے' اس لئے بہت سے مسائل میں انہیں امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف بھی تھا۔)

حضرت ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ میری آنکھوں نے ابوحنیفہؒ جیسا نہیں دیکھا۔ جو شخص

علم مغازی سیکھنے کا ارادہ کرے وہ مدینہ منورہ جائے اور جو مسائل حج سیکھنا چاہے وہ مکہ مکرمہ میں جائے اور جو علم فقہ حاصل کرنا چاہے اسے لازم ہے کہ وہ کوفہ جا کر امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کو لازم پکڑے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقیہہ نہیں دیکھا اور وہ خیر کی نشانی تھے۔ کسی نے دریافت کیا خیر کی یا شر کی؟ اس پر ابن مبارکؒ نے فرمایا خاموش رہ۔ شر کے لیے لفظ غایہ استعمال ہوتا ہے، آیہ نہیں۔ آیہ خیر کی نشانی ہے اور خیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اگر رائے کی ضرورت ہو تو امام مالکؒ سفیانؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی آرا درست ہیں۔ ان سب میں امام ابوحنیفہؒ سب سے زیادہ فقیہہ اور اچھے فقیہہ تھے اور باریک بین فقیہہ میں سب سے زیادہ غور وخوض کرنے والے تھے۔ ایک اور جگہ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ جب ہمیں کسی موضوع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہ ملے تو ہم ابوحنیفہؒ کے قول کو حدیث کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں لوگوں سے حدیث بیان کر رہا تھا اور میں نے جب یہ کہا کہ حدیث بیان کی مجھ سے نعمان بن ثابت نے تو مجلس والوں میں سے کسی نے پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہے؟ میں نے کہا ابوحنیفہؒ جو علم کا مغز ہے۔ یہ سن کر بعض لوگوں نے حدیث لکھنا چھوڑ دیا تو میں کچھ دیر تو خاموش رہا پھر میں نے کہا اے لوگو! تم آئمہ کے ساتھ بے ادبی اور جہالت کا معاملہ اختیار کرتے ہو تم علم اور علماء کے مرتبے سے جاہل ہو۔ امام ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر کوئی قابل اتباع نہیں کیونکہ وہ متقی پرہیزگار ہیں مشتبہ چیزوں سے بچنے والے ہیں۔ علم کا پہاڑ ہیں۔ علم کو ایسے کھولتے ہیں کہ ان سے پہلے کسی نے اتنی باریک بینی اور ذکاوت سے ایسا نہیں کھولا۔ اس کے بعد ابن مبارکؒ نے قسم کھائی کہ میں تم سے ایک ماہ تک کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا۔

حضرت ابن جریجؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے علم اور شدت تقویٰ اور حفاظتِ دین حفاظت علم

کے بارے میں فرمایا کہ بے شک وہ بڑے فقیہہ ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ تقویٰ اور زہد و ایثار آخرت میں ایسے مقام پر ہیں کہ کوئی دوسرا اس مقام تک نہیں پہنچ سکا۔

محدث حضرت یزید بن ہارونؒ نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کی کتب کو دیکھا کرو کیونکہ میں نے کسی فقیہہ کو نہیں دیکھا جو ان کی کتابوں کو دیکھنا پسند نہ کرتا ہو۔

حضرت خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے لیے اپنی نمازوں میں دعا کریں، کیونکہ انہوں نے سنتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ کو محفوظ کر دیا ہے اور جو شخص جاہلیت اور اندھے پن سے نکلنا چاہے اور یہ خواہش مند ہو کہ اُسے فقہ کی حلاوت حاصل ہو تو وہ امام ابوحنیفہؒ کی کتب کا مطالعہ کرے۔

حضرت مکیؒ بن ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔

حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے بہتر رائے کسی کی نہیں سنی۔ اسی لیے فقہاء ان کے اقوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔۔حضرت نضر بن شمیلؒ فرماتے ہیں کہ لوگ فقہ سے غافل تھے یعنی سوئے ہوئے تھے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے انہیں جگا دیا۔

محدث حضرت مسعر بن کدامؒ فرماتے ہیں کہ جس نے امام ابوحنیفہؒ کی اتباع کی اس پر کوئی خوف نہیں کیونکہ فقہ میں ان سے بہتر کسی کی رائے نہیں کیونکہ میں نے ان سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔

محدث حضرت عیسیٰ بن یونسؒ فرماتے ہی کہ خدا کی قسم میں نے امام ابوحنیفہؒ سے افضل کوئی شخص نہیں دیکھا اور نہ ان سے بڑا فقیہہ دیکھا۔

حضرت معمرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقہ میں اچھا کلام کرنے والا اور ایک مسئلے کو دوسرے مسئلے پر اچھی طرح قیاس کرنے والا نہیں دیکھا اور نہ ہی ان سے بہتر حدیث کی شرح کرنے والا دیکھا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ فقہ میں معروف' تقویٰ میں مشہور' وسعت مال والے تھے۔ اپنے ہم مجلسوں پر خوب خرچ کرتے تھے۔ دن رات دین کی تعلیم میں مشغول رہتے تھے۔ بہت کم گو تھے' حرام وحلال کے مسائل پر جواب' حق کے بغیر نہیں دیتے تھے۔ حکومت اور حکم رانوں سے دور رہنے والے تھے۔

حضرت قاضی ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہؒ کے لیے اپنے والدین سے پہلے دعا کرتا ہوں۔ ابوحنیفہؒ کو اللہ تعالیٰ نے فقہ' عقل' سخاوت' اچھے اخلاق سے زینت بخشی تھی۔ اور وہ اخلاق جو قرآن میں ہیں۔

حضرت محدث وکیعؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے بڑا نہ تو فقیہہ دیکھا اور نہ کسی کو ان سے اچھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

حضرت امام حافظ ناقد رجال یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں امام ابوحنیفہؒ ثقہ وصدوق تھے۔ فقہ میں اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں مامون تھے۔

حضرت ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے قاضی حسن بن عمارہؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے گھوڑے کی رکاب پکڑے دیکھا وہ فرمارہے تھے' خدا کی قسم! میں نے ان سے زیادہ فقہ میں فصیح وبلیغ کلام کرتے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی صابر وحاضر جواب' یہ اپنے وقت کے سید الفقہاء ہیں۔

حضرت محدث شعبہؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ حسن الفہم اور جید الحفظ تھے۔

حضرت محدث خارجہ بن مصعبؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ باقی فقہاء میں چکی کے مرکز یعنی قطب کی طرح ہیں یا نقاد کے مشابہہ ہیں جس سے کہ سونا پرکھا جاتا ہے۔

حضرت حافظ محمد بن میمونؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں نہ کوئی ان سے بڑا عالم تھا نہ پرہیزگار اور نہ زاہد نہ عارف نہ فقیہہ' اللہ کی قسم ان سے حدیث سننا مجھے ہزار دینار سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت ابراہیم بن معاویہؒ فرماتے ہیں دین وسنت کی علامت امام ابوحنیفہؒ سے محبت ہے۔ وہ انصاف کی تعریف کرتے اور انصاف کے مطابق کلام کرتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کے لیے علم کا راستہ واضح کر دیا اور تمام مشکلات کو حل کر دیا۔

حضرت امام داؤد طائیؒ فرماتے ہیں امام ابوحنیفہؒ ایسا ستارہ ہیں جس سے رات کے وقت مسافر راستہ پاتا ہے اور ایسا علم ہیں جس کو ایمان والوں کے دل قبول کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ مجالس کے اعتبار سے بڑے کریم اور سب سے زیادہ اکرام کرنے والے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے بھائی چارہ کرنے والے اور غریبوں کی شادیاں کرانے والے اور ان پر خرچ کرنے والے تھے۔

حضرت امام یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی آپ سے اپنی کسی ضرورت یا حاجت کا ذکر کرتا آپ اسے ضرور پورا کرتے تھے۔ جب امام صاحب کے بیٹے حمادؒ نے سورۃ فاتحہ ختم کی تو امام صاحبؒ نے اپنے بیٹے کے استاد کو پانچ سو درہم بہ طور ہدیہ پیش کئے۔ استاد نے کہا میں نے کیا کیا ہے جو آپ اتنی بڑی رقم دے رہے ہیں اس پر انہوں نے فرمایا جو آپ نے میرے بیٹے کو سکھایا ہے اس کو حقیر نہ جانئے۔ خدا کی قسم! اگر اس وقت میرے پاس اس سے زیادہ ہوتا تو قرآن کی تعظیم کے لیے میں سب حاضر کر دیتا۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ بہت زیادہ صدقہ کرنے والے تھے۔ انہیں جو بھی مال حاصل ہوتا اس میں سے کچھ نہ کچھ وہ ضرور خیرات کرتے جو ہدایا ان کے پاس آتے میں ان کی کثرت سے تنگ ہونے لگا تو میں نے امام صاحب کے شاگردوں

سے اس کی شکایت کی تو انہوں نے بتایا کہ اگر آپ ان ہدایا کو دیکھتے جو امام صاحبؒ نے حضرت سعید بن عروبہؒ کو دیئے تو آپ حیران رہ جاتے۔ امام صاحبؒ تو ہر محدث کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں اور خوب ہدیے بھیجتے۔

حضرت مسعرؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ جب اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لیے کپڑا وغیرہ یا پھل وغیرہ خریدتے تھے تو اس سے پہلے وہ وہی چیزیں بڑے بڑے علماء کے لیے بھی خریدتے تھے۔

اہلِ سنت کون؟

امام اعظم ابو حنیفہؒ امام اہل سنت کے طور پر بھی معروف ہیں اور فقہ حنفی کے ماننے والے خود کو اہلِ سنت کہلاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ امام اعظمؒ کی فقہ کے بارے میں کچھ تحریر کرنے سے پہلے ہمیں یہ علم ہونا بھی ضروری ہے کہ دراصل اہل سنت کون ہیں اور مسلک اہلِ سنت درحقیقت کیا ہے؟ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے جو مسالک ہیں ان پر مختصر اتقابلی جائزہ سے یہ آسانی ہوگی کہ مختلف مسالک کے خدوخال ہمارے سامنے ہوں گے تو فقہ حنفی کو سمجھنا آسان تر ہو سکے گا اور آج کا عام مسلمان جس کی دینی معلومات بس واجبی ہیں اور جن کے دلوں میں بعض غلط روایات کے ذریعے شکوک وشبہات پیدا کر دیئے جاتے ہیں جس کے باعث وہ دین سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں جب دیگر مسالک کے افراد سے ملتے ہیں اور کسی مسئلے پر بحث یا گفتگو کرتے ہیں تو مزید الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوا کہ فقہ حنفی پر عمل پیرا ہونے والوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کی فقہ کیا ہے اور دوسرے فقہوں سے اسے کیا امتیاز حاصل ہے۔

اس سے قبل کہ فقہ حنفی پر گفتگو کی جائے یہ سمجھ لیا جائے کہ اہلِ سنت کسے کہتے ہیں اور کون حقیقی معنوں میں اہل سنت ہیں۔

اہلِ سنت:۔

سنت کے معنی عادت یا دستور کے ہیں۔ اصطلاحاً پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر عمل کو سنت کہتے ہیں۔ اسلام میں اطاعتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ابتدا سے ہی ایک لازمی امر رہا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے حفظ واشاعت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد تابعینؒ اور ان کے بعد تبع تابعینؒ کے عہد میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واحد مستند ذریعہ حدیث نبوی ہی تھا۔ اس لیے تدوین حدیث کا سلسلہ محدثین نے عہد نبوی سے ہی شروع کر دیا تھا جو بعد کے تمام عہدوں میں جاری رہا وہ تمام احادیث جو قولی ہوں یا فعلی جواحادیث کی کتب میں مفصل قلم بند کی جاچکی ہیں۔ ان میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل اور ہدایات بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت انہیں واجب العمل تسلیم کرتی ہے۔ اور مانتی ہے یہی اہلِ سنت یا سنی کہلاتے ہیں۔ اور قرآنی احکام اور احادیث نبوی کی صحیح تعبیر و تفصیل جو فقہ کے مستند امام ابوحنیفہؒ کے قیاس اور اجماع پر مبنی ہے کو اہلِ سنت اپنے مذہبی دستور العمل کا جزو لازم سمجھتے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت:۔

سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر عمل کرنے والے مسلمانوں کا سوادِ اعظم اپنے جامع مفہوم میں اسلام کے دو بنیادی فرقوں میں سے ایک ہے۔ جن لوگوں نے اسلامی جمہوریت وخلافت، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہ پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کیا وہ اہل سنت کہلائے۔ اور جن لوگوں نے سنتِ رسول کریم سے انکار کیا وہ خوارج اور معتزلہ کہلائے۔ خوارج اور معتزلہ کا عروج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور کچھ عرصے بعد یہ فرقے اپنی موت آپ مر گئے۔ ان کا وجود ختم ہو گیا۔

اہلِ سنت پیروکاروں کے معنی میں سنی کہلاتے ہیں۔ جبکہ خوارج اور معتزلہ کی تعلیمات آگے چل کر عراق اور ہندوستان میں نمودار ہوئیں۔ جو منکرین حدیث یا اہلِ قرآن کہلائے۔ انکارِ سنت کا دوبارہ آغاز انگریزوں کی فتنہ سامانی اور اختراع طرازی اور ہندو... سے

مسلمانوں کو تقسیم کر کے ان کی قوت کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا۔ انگریز نے اپنی چالا کی اور بدنیتی اور حکمرانی کی قوت سے کام لے کر مسلمانوں کی ایک منظم جماعت کو کئی فرقوں میں بانٹ دیا اور مسلمانوں کی قوت ایمانی کو پارہ پارہ کرنے کی مذموم کوشش وسازش کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو کئی فرقوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

ہندوستان میں جدید علم الکلام کے نام پر سرسید احمد خان نے انکارِ حدیث کی ابتدا کی۔ سرسید احمد خان نے قرآنِ حکیم کے تمام مندرجات کو عقل وسائنس کے مطابق ثابت کیا ہے۔ مثلاً وہ معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شق الصدر کو محض خواب مانتے ہیں۔ روز آخرت، حساب کتاب، میزان، جنت ودوزخ، کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو استعارہ اور تمثیل قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہی وہ ابلیس اور ملائکہ کے وجود کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونے اور آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کو تمثیل قرار دیتے ہیں۔ جنوں کو بھوتوں کی قسم کی مخلوق ماننے سے سرسید احمد خان قطعی انکار کرتے ہیں۔ سرسید کے علاوہ مولوی چراغ علی بھی منکرِ حدیث کے طور پر مشہور ہے۔ سرسید احمد خان جنہوں نے مذہبی مصلح کی حیثیت سے تصانیف کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا۔ سرسید کے ان ہی اقدامات کی بناء پر ان پر کفر کے الزامات بھی لگائے گئے چونکہ ان کا مسلک تھا کہ انگریز اور مسلمانوں کے درمیان پھیلی نفرت کو دور کرنے میں ہی مسلمانوں کا بھلا ہے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانون اور عیسائیوں کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے تصانیف کا سہارا لیا۔ وہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔ تقلید کے قائل علمائے کرام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حضرت حاجی عابد حسین نے وقت کی ضرورت اور مذہبی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اور امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کے قائل ان افراد نے سرسید احمد خان کی جدید توجیہات اور تاویلات جو نا صرف پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں کو مسموم ومتاثر کرنے لگی بلکہ

دین سے لاتعلق افراد بھی اس طرف متوجہ ہونے لگے تھے اور اس لیے ضروری تھا کہ اس کی روک تھام کی جائے۔ 1867ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھتا میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ جو بعد میں مدرسہ دیوبند کے نام سے معروف ومشہور ہوا۔ دیوبندی علماء فقہی مذاہب میں امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ قرآن وسنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ کثرت سے درود کو عین ثواب سمجھتے ہیں۔ دین میں غلو اور انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کے قائل ہیں اور عامتہ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب واحتیاط کو لازمی سمجھتے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو دیوبند مدرسے سے اٹھنے والی تحریک نے سرسید احمد خان کے جدید علم الکلام کے ذریعے پھیلائی ہوئی ظلمتوں کا مقابلہ کرنے اور صحیح دین اور تقلیدی عمل کو قائم رکھنے اور برصغیر کے مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح سے وابستہ کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

سرسید احمد خان کی جدیدیت یعنی جدید علم الکلام کے فتنے نے جب کافی سر اٹھالیا اور جدت پسند افراد کا گروہ تشکیل پانے لگا تو انہوں نے مئی 1875ء میں علی گڑھ میں ایک درس گاہ کا آغاز کیا جسے جنوری 1877ء میں کالج کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ اسی جدیدیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ردعمل کے طور پر دیو بند کی مسجد چھتا میں مدرسہ قائم ہوا جو جلد ہی ایک بڑے دارالعلوم میں تبدیل ہوگیا وہ تمام دینی تعلیمی اصناف کی تعلیم دی جانے لگی۔ دارالعلوم دیوبند میں علم صرف ونحو' ادب' علم المعانی' منطق' فلسفہ' فقہ' اصولِ فقہ' حدیث' تفسیر' علم الفرائض' علم العقائد' علم الکلم' علم الطب' علم المناظرہ' علم ہیئت' علم قرأت وتجوید ساتھ ساتھ فارسی زبان ادب وریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

دیوبند کے پیروکار نذر و نیاز صرف اللہ کے نام پر کرنا جائز مانتے ہیں کسی پیر بزرگ کے نام پر کرنا ان کے مسلک کے مطابق قطعی حرام ہے کیونکہ منت نذر نیاز حقیقی معنوں میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہی ہے۔ اس طبقے کے مطابق اللہ کے علاوہ کسی دوسرے

کے نام کی منت ماننا یا نذر دینا صدقہ کرنا سب شرک ہے۔ جس چیز کی منت مانی جائے وہ حلال ہو اور اللہ کی راہ میں ہو تو اللہ اس کے پورا کرنے پر اجر و ثواب دے گا۔ اس بارے میں سورۃ البقرہ 270 یا 271 میں واضح ہدایت آئی ہے۔

دیوبند کے طریقے پر چلنے والے مزارات کا احترام تو کرتے ہیں لیکن مزار والوں کو کسی طرح وسیلہ یا واسطہ نہیں بناتے بلکہ براہ راست اللہ سے مدد مانگتے ہیں کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ یہ لوگ مزارات پر چراغاں کرتے ہیں نہ موم بتی یا گربتی جلاتے ہیں۔ نہ مردے دفن کرنے پر اس کے سرہانے اذان دیتے ہیں۔ درود شریف کثرت سے پڑھتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ درود شریف براہ راست انہیں پہنچایا جاتا ہے یہ تمام صدقات و خیرات براہ راست اللہ کے نام پر اللہ کے لئے کرتے ہیں۔

اکابرین دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معتقد ہیں جبکہ روحانی مسلک کے لحاظ سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں۔ سرسید احمد خان کی تحریک کے نتیجے میں مختلف مسلکوں نے جنم لیا۔

عام طور پر مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں ایک اہلِ سنت والجماعت اور دوسرا اہلِ تشیع۔ بالترتیب ان کے ماننے والوں کو سنی اور شیعہ کہا جاتا ہے۔ علامہ بغدادی کے نزدیک اہل سنت وہ لوگ ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے یعنی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مسلک پر قائم ہیں۔ انہوں نے اہلِ الرائے اور اہل حدیث دونوں کو اس گروہ میں شامل کیا ہے۔ جبکہ امام ابن تیمیہؒ نے اہلِ سنت والجماعت کو آئمہ اربعہ سے پہلے کا قرار دیا ہے اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی گروہ میں شامل کرتے ہیں۔ علامہ الذہبیؒ کے بقول ابوالحسن اشعری کی تحریک اشعریہ کو ماننے والے خود کو اہلِ سنت

والجماعت کہتے تھے ان کے بعد یہ اصطلاح عام ہو گئی۔

علامہ البغدادیؒ نے اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

یہ لوگ حدوثِ عالم، خالقِ کائنات کی وحدانیت، اس کی تشبیہہ و تجسیم سے پاک ہونے اور انسانوں کے لیے کافی اور برحق ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ قرآن حکیم شریعت کے احکام کا ماخذ و منبع ہے اور نماز قبلے یعنی کعبے کی طرف منہ کر کے ادا کرنا فرض ہے۔ ان باتوں کے ساتھ انہیں کسی ایسی بدعت میں ملوث ہونا پسند نہیں جو کفر کا باعث ہو۔

علامہ البغدادیؒ نے اہلِ سنت والجماعت کی آٹھ اصناف بیان کی ہیں۔

(۱) وہ اربابِ عمل جو توحید، نبوت، احکام، وعدہ وعید، ثواب و عتاب، اجتہاد اور امامت وقیامت کے بارے میں صحیح اور کامل معلومات سے بہرہ ور ہیں۔

(۲)۔ فقہا، جو قرآن وسنت اور اجماعِ صحابہ سے استنباطِ احکام کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں ان میں آئمہ کرام امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، اوزاعی، ثوری وغیرہ شامل ہیں۔

(۳)۔ علمائے حدیث۔

(۴)۔ علمائے ادب و نحو، مثلاً خلیل بن احمدؒ، ابوعمرو بن العلاؒ، سیبویہ، اخفش، اصمعی، المازنی اور ابوعبیدہؒ وغیرہ۔

(۵)۔ مندرجہ بالا عقائد کے مفسرین اور قرائے کرام وغیرہ۔

(۶)۔ مندرجہ بالا مسلک کے موید صوفیا اور اولیائے کرام۔

(۷)۔ مجاہدین اور شمشیر بکف محافظینِ دین۔

(۸)۔ عام پیروکاران، اہلِ سنت والجماعت۔

جماعت اہلِ سنت کے عقائد کو مختلف خلفا اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔

مسلمان محققین کے مطابق خلفائے راشدین بھی اسی مسلک کے پیروکار تھے۔ المتوکل کے دور میں اس مسلک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مصر شام میں صلاح الدین ایوبی اور اس کے وزیر القاضی الفاضل نے اس مسلک کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ مغربی افریقہ اور اندلس میں بھی اسی مسلک کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے بھی اسی مسلک کو سرکاری حیثیت دی۔ ایسا ہی اورنگزیب اور ٹیپو سلطان کے دور میں بھی ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان میں اکثریت حنفی اہلِ سنت کی ہے۔

شبلی نعمانیؒ کہتے ہیں کہ فقہ حنفی اور اس کے پیروکار افراد بہترین مقنن تھے اسی لیے انہوں نے قاضی بن کر اسے عملی طور پر نافذ کر دیا۔ حنفی فقہ کے قبولِ عام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ فقہ انسانی ضرورتوں کی موجودگی میں نہایت موزوں اور مناسب لگتا ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت کی تہذیب سے اس فقہ کو مناسبت تھی جس کے باعث زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ فقہ حنفی میں یہ خصوصیت ہے کہ دینی مسائل میں پریشان افراد کو آسان طریقوں سے سہولت باہم پہنچاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی دیگر فقہوں کی نسبت فقہ حنفی کے ماننے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی اب دیگر فقہوں کی نسبت حنفی فقہ کے ماننے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ وہ فرقہ اہلِ سنت والجماعت یا سنی کہلاتا ہے۔

اس سے قبل کہ دیگر فرقوں کے متعلق کچھ فقہی معلومات حاصل کی جائیں بہتر ہوگا کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ فرقہ ہے کیا؟ اور یہ کیسے عالم وجود میں آتے ہیں؟

فرقہ کیا ہے؟

فرقہ کسی جماعت یا اجتماعیت کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہونا۔ اس طرح تقسیم ہونے والے بڑے گروہوں کو فرقہ اور چھوٹے گروہوں کو طائفہ کہا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کلامِ مبارک میں اس اختلاف کی مذمت کر رہا ہے جو انسان کی نفسانی خواہشات اور کج نگاہی سے شروع ہو اور اسے فرقہ بندی تک پہنچادے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنی اس رسی کو جو ''حبل اللہ المتین'' ہے کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دے رہا ہے یعنی اہلِ ایمان کو اتحاد واخوت کی تعلیم دی جارہی ہے۔

قرآن کریم ایسے اختلاف رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظام جماعت میں متحد رہ کر محض احکام وقوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے۔ ایسا اختلاف معاشرے کی ترقی اور زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس قسم کے اختلاف کی کئی مثالیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی پیش آچکی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے اختلافِ رائے کو پسند فرمایا کیونکہ یہ اختلاف اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ امت میں غور وفکر، تحقیق، فہم وفراست کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس صورت میں جو اختلاف سامنے آتا ہے وہ اللہ اور رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں رہ کر قرآن وسنت پر اتفاق رائے کرتے ہوئے دو عالموں یا دو ججوں کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی رائے کو مدارِ دین نہیں بناتے اور نہ ہی اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں بلکہ

دونوں اپنے اپنے دلائل کے ذریعے کسی مسئلے پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی بھی رائے کو اپنایا جا سکتا ہے۔

احادیث اور تاریخ کی کتب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی مسئلہ پر ایسا صحت مند اختلاف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی ہوا اور بعض مسائل پر مشورہ کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان قرآن کریم کی آیات کی تفسیر میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن ایسے کسی اختلاف کی وجہ سے کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے امت مسلمہ سے ہٹ کر اپنا کوئی الگ گروہ یا فرقہ نہیں بنایا' کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے بہ خوبی آگاہ تھے کہ دین میں تفرقہ بندی کرنے والے ظالم ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اتحاد و اتفاق کا حکم دیا ہے اور اختلاف و تفرقہ سے منع فرمایا ہے۔ امت میں اختلاف و تفرقہ کے باعث بہت سے فرقے بن جاتے ہیں جن کے باعث دینی معاملات میں الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں ان اختلافات کو صرف اصولی بنیاد پر ہی رکھا جائے اور اختلافِ رائے ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے سے نفرت کا اظہار نہ کیا جائے۔

اختلاف ایک فطری امر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے طبائع و اذہان میں ایک دوسرے سے فرق رکھا ہے۔ مسلمانوں میں سیاسی اور عقائد کے معاملات میں اختلاف ہوئے ہیں لیکن یہ اختلاف پر کوئی فرقہ نہیں پیدا ہوا۔ دیانت دارانہ اختلافِ رائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کی رو سے باعث رحمت ہے کیونکہ اختلافِ رائے کے ذریعے ہی مختلف احکامات' تعبیر و تشریح کے لیے اجتہاد کے دروازے کھلتے ہیں اور دین کے حقائق واضح و روشن ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اختلاف رائے نہ ہونے سے امت میں جامدیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اختلافِ رائے اکثر سیاسی مسائل میں ہی پیدا ہوا مسلمانوں کے دینی

اختلافات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱)۔ اصولی اختلافات۔ اسلام کے سیاسی نظام یعنی امامت وخلافت کے مسئلے پر اختلاف جس سے مسلمانوں کے دو گروہ سامنے آئے۔ اہلِ سنت اور شیعہ۔

(۲)۔ ہنگامی نوعیت کے اختلافات۔ عقائد کے مسئلے پر چند متشدد نقطہ نگاہ رکھنے والے جواب موجود نہیں ہیں مثلاً جبریہ، قدریہ، معتزلہ وغیرہ۔

(۳)۔ فقہی اختلافات۔ فروعی مسائل پر فقہی مسالک مثلاً اہلِ سنت میں آئمہ اربعہ کے مذاہب اور چند دوسرے مذاہب جن کا اب وجود نہیں رہا۔

(۴)۔ سیاسی اور قبائلی اختلافات۔ فرقہ بندی کے سلسلے میں دو انتہا پسند طریقے پائے جاتے ہیں ان میں ایک طریقہ یا دستور یہ ہے کہ حقائق کی تحقیق کی خاطر دیانت دارانہ اختلافِ رائے کا ہونا چاہئے اور اس میں کسی قسم کی مصلحت اور مفاہمت نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مصلحت کو مقدم رکھا جائے اور کسی بھی مسئلہ پر اختلاف نہ کیا جائے۔ یہ دونوں نقطہ نظر افراط وتفریط پر قائم ہیں۔

درحقیقت کسی بھی رائے میں اختلاف کرنا ایک قدرتی امر ہے اس سے فرقہ بندی پیدا نہیں ہوتی لیکن ایسا صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب اختلاف کی بنیاد حق ودیانت اور اخلاص پر ہو۔ ایسا اختلاف وضع ہوسکتا ہے لیکن جب اختلاف نفسانی اغراض بددیانتی اور تعصب پر مبنی ہو تو پھر مستقل فرقے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کی واضح مثال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں ہونے والے اختلافات ہیں جو خالص اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی تھے اس لیے وہ جلد ہی ختم بھی ہوگئے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہونے والے اختلافات جن کا ذکر علامہ شہرستانی ابوالفتح محمد بن القاسم عبدالکریم نے اپنی کتاب ''الملل والنحل'' میں کیا ہے۔

(۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں قلم دوات طلب کرنے کا واقعہ۔

(۲)۔ جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کا مسئلہ۔

(۳)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا مسئلہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا سکتے ہیں یا نہیں۔

(۴)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کہاں ہو؟

(۵)۔ خلافت کی منتقلی کا مسئلہ۔

(۶)۔ باغ فدک کا معاملہ۔

(۷)۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے خلاف جنگ۔

(۸)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کرنا۔

(۹)۔ تیسرے خلیفہ راشد کے انتخاب کے سلسلہ میں شوریٰ کا اختلاف۔

(۱۰)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ اجمعین اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اختلافات۔

یہ تمام اختلافات بالکل نئی صورت حال میں صحیح سمت کی تلاش میں اصولی نوعیت کے تھے اور ان کی بنیاد حق اور اخلاص پر تھی اس لیے ان اختلافات کے باعث کسی فرقے نے جنم نہیں لیا۔ بعض لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف کو فرقہ بندی کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''میری امت بنی اسرائیل کی طرح فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔'' (کتاب الفتن ابن ماجہ)

یقیناً یہ حدیث مبارکہ ہر لحاظ سے واجب الاحترام ہے لیکن اس کی تفسیر کرتے وقت فرقوں کی کثرت کو ناگزیر بنانا قطعی زیادتی ہے۔ حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کی مثال بیان فرما کر مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی حدود کو پھلانگ کر آپس میں تفرقوں کی صورت نہ پیدا کرنا کیونکہ تفرقوں کی ہی وجہ سے بنی اسرائیل تباہ ہوئے تھے۔ حدیث مبارکہ میں دراصل فرقوں کی ترغیب نہیں دی گئی اور نہ ہی فرقوں کے لیے اس حدیث شریف سے جواز نکلتا ہے۔ اس حدیث شریف کا جواز قرآن حکیم سے اس طرح نکلتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں ربِ کائنات فرما رہا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ (تفرقہ) نہ ڈالو اور اللہ تعالیٰ کی اُس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی' پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے' اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (آل عمران۔۱۰۳)

اس آیت مبارکہ پر اگر غور و فکر کیا جائے تو ولا تفرقوا یعنی پھوٹ نہ ڈالو کہہ کر اہلِ ایمان کو فرقہ بندی پھوٹ اختلاف سے روک دیا گیا ہے آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ خوب واضح طور پر بتا رہا ہے کہ اگر تم نے دو مذکورہ اصولوں سے انحراف کیا یعنی اختلاف کیا تو تم میں پھوٹ پڑ جائے گی اور تم الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ وہ دو چیزیں قرآن اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر ہم فرقہ بندی کی تاریخ کو دیکھیں تو یہی دو چیزیں نمایاں ہو کر

سامنے آجاتی ہیں۔ قرآن وحدیث کے فہم اوراس کی توضیح وتشریح میں باہم کچھ اختلاف فرقہ بندی کا سبب بنتا ہے حالانکہ یہ اختلاف تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وتابعین رحمت اللہ علیہم کے عہد میں بھی تھا لیکن مسلمان کبھی فرقوں، گروہوں میں نہیں تقسیم ہوئے تھے کیونکہ اس وقت تمام اختلافات کے باوجود سب کا مرکز اطاعت ومحور عقیدت ایک ہی تھا یعنی قرآن وحدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، لیکن جب شخصیات کے نام پر سوچ فکر نے جنم لیا تو اطاعت عقیدت کے محور ومرکز تبدیل ہوگئے۔ پھر ہر کوئی اپنی اپنی پسندیدہ شخصیات اور ان کے اقوال وافکار کو اولین حیثیت دینے لگا اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام وفرمودات ثانوی حیثیت کے حامل ہوگئے۔ یہیں سے امت مسلمہ میں افتراق کے المیے نے جنم لیا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ روشن ترین دلیلوں کے باوجود مسلمانوں نے نفسانی اغراض کے لیے جب اختلاف وتفرقہ کی راہ اپنائی اور اس پر جم گئے اور اپنے دنیاوی مفادات کے لیے سب کچھ جانتے سمجھتے بوجھتے ہوئے حقیقت سے انحراف کیا اور فرقہ بازوں کی باتوں میں آ کر اللہ اور رسول اللہ کی راہ سے دور ہوگئے ہیں۔ قرآن حکیم نے مختلف انداز وپیرائے میں بار بار اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے اور اس سے دور رہنے کی تاکید کی ہے۔ یہ بھی بتادیا کہ بنی اسرائیل حقیقت سے انحراف کے باعث ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اے اہل ایمان تم ایسا نہ کرنا۔

اختلاف رائے میں شدت کی وجہ سے اب تک سیکڑوں فرقے بنے اور مٹ گئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی کتاب تحفہ اثنائے عشریہ میں صرف شیعہ مسلک کے ۷۳ سے زاید فرقوں کا ذکر کیا ہے جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث سے مسلمانوں میں جن ۷۳ فرقوں کا جواز نکالتے ہیں جب وہ فرقوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں تو فرقوں کی تعداد اس گنتی سے کہیں زیادہ ہوجاتی ہے۔

ابتدا میں فرقوں کی تعداد کم تھی اس لیے کہ اختلافات بھی کم ہوتے تھے پھر بعد کے ادوار میں اختلافات کی کثرت کے باعث معمولی معمولی اختلاف پر ذیلی مسالک کو فرقوں کا نام دیا جانے لگا۔ حالانکہ اہل ایمان مسلمان اگر تعلیمات اسلام جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ودیعت فرمائیں ان کی رو سے تو تمام عالم انسانیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ایک قوم یا قبیلے یا علاقے کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام عالموں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں آپ کو رحمت للعلمین بنایا گیا تمام عالم آپ کی امت ہے اس امت عالم میں جتنے بھی سابقہ ادیان ہوں گے وہ اپنی جگہ بے شک فرقوں کی مانند ہوں گے لیکن ہمارے کمزور اہلِ ایمان شیطان کے بہکاوے میں پھنس کر اختلافِ رائے پر ایسے جم جاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ اور پھر ایک نیا فرقہ بنا کر ہی دم لیتے ہیں۔

حضرت علامہ اشعریؒ نے اپنی کتاب ''مقالات الاسلامین'' میں ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جو اختلاف کی وجہ بنے۔ ان مسائل میں سب سے اہم اور پہلا امامت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ طرزِ حکومت کے معاملے میں اب تک دو ہی نقطہ نظر کارفرما رہے ہیں۔ ایک شخصی موروثی طرزِ حکومت یعنی اہلِ تشیع کا امامت کے متعلق نظریہ دوسرا شورائی نظام یعنی خلافت۔ مسئلہ امامت پر نزاع تمام اختلافی معاملات میں نظر آتا ہے چاہے وہ شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہو یا جنگ جمل ہو یا جنگ صفین اور بعد کے معاملات میں اصولی وجہ نزاع امامت تھی جو مختلف احوال ومقامات اور اشخاص سے متعلق ہو ہو کر نئی ذیلی شاخوں میں پھیلتی چلی گئی۔

''مقالات الاسلامین'' میں مذکورہ فرقوں کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصولی فرقے تو بہت کم ہیں لیکن ذیلی نقطہ نظر کی وجہ سے فرقوں کی بھرمار معلوم ہوتی ہے۔

اصولی فرقوں کی کل تعداد پانچ سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱)۔اہل سنت۔(حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی' اصحاب الحدیث واہل حدیث)

(۲)۔شیعہ۔(علویہ' زیدیہ' امامیہ' اسماعیلیہ)

(۳)۔خوارج۔(ریاضیہ' اباضیہ' ارزقیہ)

(۴)۔مرجیہ۔(راجیہ' شاکیہ' تارکیہ)

(۵)۔معتزلہ۔

شہرستانی ابوالفتح نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اصل فرقے چار تحریر کئے ہیں اور باقی فرقے ان چاروں سے ہی نکلے ہیں۔ ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔(۱)قدریہ (۲)اصفاتیہ (۳)خوارج (۴)شیعہ۔

امت مسلمہ کے ان فرقوں میں بڑے فرقے صرف دو ہیں۔ سنی اور شیعہ۔ یہ دونوں فرقے افکار وعقائد میں نسبتاً ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

اہل سنت کے عروج کے بعد مرجئہ' معتزلہ آہستہ آہستہ اصولی فرقوں میں مدغم ہو گئے۔ ابومنصور عبدالقادر بن طاہر بن محمد البغدادیؒ نے اپنی کتاب ''الفرق بین الفرق'' میں اہل سنت کے علاوہ ۷۲ فرقوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ شیعوں' خوارج اور قدریہ کے بیس بیس مرجیہ کے دس بخاریہ اور کرامیہ کا ایک ایک فرقہ ہے۔ عبدالقادر البغدادیؒ نے فرقوں کو مزید اس طرح تقسیم کیا ہے۔

(۱)۔فرق الاہواء الضالتہ۔ خواہشات نفسانی پر قائم گمراہ فرقے۔

(۲)۔الفرقیہ۔الناجیہ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ ۷۳ فرقوں میں ایک فرقہ ناجیہ ہوگا اور ۷۲ فرقے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلے گا۔'' اسی باعث اب مسلمانوں کا ہر فرقہ خود کو ''ناجی'' کہلواتا ہے۔

اہلِ سنت میں دین کے فروعی مسائل کے نقطہ نگاہ سے چار مشہور مسلک ہیں جو اپنے اپنے آئمہ کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کو اصطلاحاً مُقلد بھی کہتے ہیں۔

(۱) حنفی (۲) شافعی (۳) مالکی (۴) حنبلی۔

(۱) حنفی کون؟:۔

مسلمانوں کا ایک فرقہ جو امام اعظم ابو حنیفہؒ کی پیروی وتقلید کرتا ہے۔ امام اعظمؒ سے اس کی ابتداء ہوئی' یہی اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ سے پہلے بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباط اور اجتہاد سے کام لیا اور وہ مجتہد اور فقیہہ کہلائے۔

فقہ حنفی کے ابتدائی ماخذوں میں تین چیزیں ہیں۔

(۱) امام اعظم ابو حنیفہؒ کی کتب اور فتوے۔

(۲) آپ کی مجلس فقیہہ کے فیصلے (یہ مجلس فقیہہ آپ نے شریعت کی تدوین کے لیے اپنے طور پر سرکاری سرپرستی ومدد کے بغیر قائم کی تھی)

(۳)۔ آپ کے قابل و نامور شاگرد قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمد بن الحسنؒ۔ امام زفرؒ کی تصانیف اور آراء۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں امام ابو یوسفؒ نے فقہ حنفی کے استحکام اور تدوین کے لیے بہت کام کیا ہے۔ ابن الندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں کچھ کتب کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک کتاب ''الخراج'' ہے یہ کتاب فقہ حنفی کی بہترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ یہ خود امام اعظم ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ ''میرے شاگردوں میں جس نے سب سے زیادہ علم حاصل

کیا وہ ابو یوسفؒ ہے۔''

فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب فتاویٰ عالمگیر یہ ہے۔ یہ کتاب مختلف فتاویٰ کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ حنفی مسلک کے بارے میں لکھی گئی تمام کتب کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ فقہ حنفی کے ماننے والوں کو اہلِ الرائے بھی کہا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی کتاب سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے جب فقہ کی تدوین کی تو اس میں ہزاروں مسئلے پیش آئے جس میں کوئی صحیح حدیث یا صحابہ کرام کا قول بھی موجود نہیں تھا۔ اس لیے انہیں قیاس سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے بھی قیاس کیا جاتا تھا لیکن اس وقت مسائل اتنی کثرت کے ساتھ سامنے نہیں آتے تھے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ فقہ حنفی کو اس اعتبار سے فضیلت ملی کہ یہ شروع سے ہی قوانین کا مجموعہ ہے کیونکہ خود امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھی وشاگرد بہترین مقنن (قانون شناس) تھے جنہوں نے بنوعباس کی مملکت میں قاضی بن کر انہیں عملی طور پر نافذ کر دیا۔

امام مالکؒ بھی رائے پر اعتقاد رکھتے تھے اور اہل الرائے میں شمار کیے جاتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے پیروؤں کو قیاس کی زیادتی کے باعث اہل الرائے کا لقب دیا گیا۔ قرآنِ حکیم اور حدیث شریف کے بعد قیاس کا عمل بذات خود کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اکثر قرآن وحدیث میں کوئی تصریح نہ پا کر مجبوراً قیاس کیا کرتے تھے جسے ہم عام زبان میں رائے کہتے ہیں۔

فقہ حنفی میں تقلید شخصی ایک متنازع مسئلہ ہے۔ سقوط بغداد کے بعد سیاسی مرکزیت کے زوال کے ساتھ ساتھ فقہ کی روح بھی کمزور ہوگئی تو بعض علماء تقلید شخصی پر زور دینے لگے۔ اس طرح انہوں نے اجتہاد کے دروازے اپنے پر بند کر لیے۔ تقلید پر اصرار کی وجہ یہ تھی کہ بے شمار فرقے وجود میں آ گئے تھے جن کے باعث خیالات میں انتشار بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ

اجتہاد کے لیے جس بلند معیار اور علم وتقویٰ کی ضرورت تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا اس لیے ہی احناف اجتہاد کے خلاف ہیں۔

فقہ حنفی کے قبولِ عام کی سب سے بڑی وجہ امام اعظم ابوحنیفہ کا طریقہ فقہ ہے جو انسانی ضرورتوں کی موجودگی میں نہایت ہی موزوں اور مناسب ہے اور اس وقت کی تہذیب سے بھی فقہ حنفی بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کا سرکاری مذہب بھی یہی تھا اور جو علاقے سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت تھے ان کا مذہب بھی اور ان کا محکمہ عدل وقضاء بھی حنفی ہی رہا کیونکہ عباسی خلیفہ نے محکمہ عدل وقضاء کے لیے یہی مذہب منتخب کیا تھا۔ مسائل عبادات بھی اسی مذہب کے چلے۔

حنفی فقہ کے ماننے والے حنفی کہلاتے ہیں یہ ترکی' وسطی ایشیا اور شمالی ہند' پاکستان' بنگلہ دیش' بھارت' میں پائے جاتے ہیں اور افغانستان' ترکستان' بلقان' شام وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

مالکی:۔

امام مالک۔ ان کا پورا نام ابوعبداللہ مالک بن انس اصبحیؒ تھا۔ ۹۵ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے' اپنی پوری زندگی مدینہ میں ہی گزاری صرف ایک بار حج کے لیے مکہ تشریف لائے۔ آپ امام شافعی کے استاد بھی ہیں۔ آپ ساٹھ سال تک مدینہ منورہ میں علم حدیث کی خدمت کرتے رہے اور 87 سال کی عمر میں 179 ہجری 10 ربیع الاول کو انتقال فرمایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ اسی محبت وقربت کی وجہ سے صرف ایک فرض حج کے لیے ہی مدینہ منورہ سے باہر گئے تھے۔

اہلِ سنت والجماعت میں فقہی مسائل میں امام مالکؒ کی رائے اور عقیدہ کے پیروکار مالکی کہلاتے ہیں۔ مورخین کے مطابق شروع میں حنفی مالکی' شافعی وغیرہ قسم کے مسالک کے

نام نہیں تھے اور فقہی مسائل میں ہر قسم کے مکاتبِ فکر تھے۔ اہلِ حجاز امام مالکؒ کی آراء کی پیروی کرتے تھے۔ اور اہلِ عراق امام ابوحنیفہؒ کے پیروکار تھے پھر امام شافعیؒ نے فقہی مسائل میں ان دونوں مسالک سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی تو یہ مسلک شافعی کے نام سے معروف ہوا تو ان دونوں مسالک کے پیروکاروں نے اپنے اماموں کے ناموں کی نسبت سے حنفی اور مالکی مسلک کے نام اختیار کئے۔ امام مالکؒ اپنے اجتہاد میں صرف قرآن وحدیث پر اعتماد کرتے تھے۔ علم وحدیث میں ان کی کتاب مؤطا ہے۔

مالکی عقائد مغرب کے علاقوں میں پھیلنا شروع ہوئے۔ ان علاقوں میں الجزائر، طرابلس، سوڈان، بحرین، کویت، تیونس، الجیریا، مراکش اور اسپین کے علاقے شامل ہیں پھر بتدریج افریقہ اور مصر کے علاقوں میں بھی مالکی مسلک نے فروغ پایا۔ ان علاقوں میں شافعی مسلک کو عبدالمالک بن حبیب سلیمانی ۸۵۴ عیسوی اور اسماعیل ابن اسحاق ۸۹۰ عیسوی نے مالکی مسلک کے فروغ میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔

شافعی:۔

امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ قریشی ۱۵۰ ہجری میں غزہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ امام شافعی شروع میں امام مالکؒ کے معتقد تھے لیکن اپنے سفر کے تجربات کے بعد اپنے لیے ایک خاص مذہب منتخب کیا۔

اہلِ سنت والجماعت میں فقہی مسائل میں امام شافعیؒ کی رائے اور عقیدہ کے پیروکار شافعی کہلاتے ہیں۔ ان کا دور ۷۶۷ء پیدائش اور وفات ۸۲۰ء کا ہے۔ ان کا سلسلہ نسبت عبدمناف پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا اور پندرہ برس کی عمر میں انہیں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی تھی۔ ان کی پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ امام شافعی تیرہ برس کی عمر میں مکہ سے مدینہ میں امام مالک بن انسؒ کے پاس ان کی

شاگردی میں چلے گئے اور امام مالکؒ کی وفات پر ہی مکہ واپس آئے۔ انہیں بجا طور پر اصول فقہ کا مؤسس و بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ ان احادیث کی تحقیق پر تھی جن سے احکام شرعی کے ثبوت مہیا ہوں۔ اس وقت شافعی فقہ کے ماننے والے زیادہ تر بیروت، سریا، عراق، جاوا، ایران اور یمن کے علاوہ وسطی افریقہ، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیاء کے بعض حصوں میں ہیں۔ امام شافعی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصول احکام مرتب کئے اور اصول فقہ کو علمی حیثیت دی۔

حنبلی:۔

اہلِ سنت والجماعت میں چوتھے مسلک اور فقہی مسائل میں امام ابوعبداللہ احمد بن حنبلؒ کی رائے اور عقیدہ کے پیروکاروں کو کہا جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نسلاً عرب تھے۔ اصلاحی تحریکوں کے محرک امام احمد بن حنبلؒ کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے۔ حنبلی فقہ کے اصول وقواعد کے بارے میں محققین نے بہت کم لکھا ہے حنبلی تعلیمات کے متعلق مورخین و محققین کی مسلمہ رائے ہے کہ یہ ایک تندمزاج تشبی مذہب ہے دیگر فقہوں کی نسبت خاصا دبا ہوا ہے اس میں بظاہر زندگی کی حرارت نظر نہیں آتی مگر بغور دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کی اصل تعلیمات کو مسخ کیا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ کے بعد محمد بن عبدالوہابؒ نے حنبلی مذہب کی تجدید کی۔ اہلسنت کے مذاہب میں یہ مذہب سب سے آخری اور چوتھا ہے۔

قرآن کریم کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا نظریہ ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور غیر مخلوق ہے۔

حدیث کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کی رائے ہے کہ صرف وہی احادیث قابل قبول ہیں جن کے متعلق یقین ہو کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پہنچی ہیں۔ اس لیے انہوں نے وہی احادیث جمع کیں جو ان کے زمانے میں ثابت ہو چکی تھیں۔ حنبلی

مسلک و مذہب کے سب سے بڑے شارح امام ابن تیمیہؒ ہیں جن کے زیر اثر کئی تحریکوں نے جنم لیا ان میں ہی ایک امام محمد بن وہابؒ بھی تھے جنہیں ماننے والے وہابی کہلاتے ہیں۔ یہ فرقہ حنبلی مسلک سے ہی نکلا ہے اس فرقہ کے ماننے والے زیادہ تر مشرقی عرب اور افریقہ کے بعض ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ سعودی عرب کا سرکاری مذہب یہی ہے اس کے علاوہ فلسطین، شام، عراق میں بھی کافی تعداد اس مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔

اہل سنت والجماعت کے ان چار مسالک میں بھی کئی کئی مزید فرقے بنے ہیں۔ اکثر علماء امتِ مسلمہ ان فرقوں کی تقسیم کو تسلیم کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اسلام میں ایک سو پچاس فرقوں کا بیان کرتے ہیں جبکہ غیاث اللغات میں اسلام کے ۷۳ فرقوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں سے ایک ناجیہ فرقہ اہلِ سنت کا ہے۔ (جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب "تحفہ اثنائے عشریہ" میں شیعہ مسلک کے ۷۲ سے زائد فرقوں کا ذکر کیا ہے۔) باقی کو چھ مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر گروہ میں بارہ بارہ فرقوں کا ذکر ہے۔ اس طرح چھ مسالک کے بارہ بارہ فرقوں کی تعداد ۷۲ ہوتی ہے اور ایک اہلِ سنت کا ناجیہ یوں کل تعداد ۷۳ پوری ہو جاتی ہے۔

اسلام میں شیعیت کے آغاز کی تاریخ بھی وہی ہے جو عیسائیت کی تاریخ ہے۔ یہودیوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کے دین کو دل سے قبول کیا اور نہ ہی عیسائیت کو۔ یہودیوں نے ہی نعوذ باللہ...... اپنی مذہبی عدالت کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی کی سزا دلوائی، لیکن اس کے باوجود حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے دعوت و تبلیغ کا سلسلہ ختم نہیں کیا بلکہ دور دراز کے علاقوں میں جا کر اس کی منادی کرنے لگے جس میں انہیں بڑی کامیابی ملی۔ عیسائیت کی غیر معمولی مقبولیت کو روکنے اور اُس دین مسیحی کو ملیامیٹ کرنے کے لئے مشہور یہودی عالم ساؤل نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اچانک اپنی دشمنی کا رنگ بدل لیا اور منافقین جو

دراصل یہودی ہی تھے کی طرح خود عیسائیوں میں شامل ہو کر اپنے علم و ہوشیاری، چالاکی سے عیسائی مذہب کا پیشوائے اعظم بن بیٹھا اور عیسائیت میں نت نئی اختراع اور تحریف کرنے لگا۔ عیسائیت قبول کرتے ہی اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر کے پولوس رکھ لیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں حد سے زیادہ غلو شامل کر کے انہیں اللہ کا بیٹا اور اللہ کا شریک بنا دیا اور صلیب پر چڑھنے کو اس حقیقت کا رنگ دیا کہ مسیح نے تمام انسانوں کے گناہوں کی سزا اور عذاب کے عوض خود یہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اس طرح مسیح کا صلیب پر چڑھ جانا ان پر ایمان لانے والوں کے گناہوں کا کفارہ اور نجات کا وسیلہ ہے اور یوں ایک صدی سے بھی کم عرصے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین عیسوی کے بجائے پولوس کا بنایا ہوا مشرکانہ نیا دین عیسائیت کے عنوان سے مقبول ہو گیا۔ (بائبل سے قرآن تک، مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترجمہ جسٹس محمد تقی عثمانی)

ایسے ہی یہودی جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو صرف اس لئے تسلیم نہیں کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قوم بنی اسرائیل سے کیوں نہیں اور اسی غم و غصے کا وہ دشمنی کی حد تک اظہار کرتے رہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے ان میں شامل ہو گئے۔ یہیں سے منافقین کا کردار شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے نے اپنے پیارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سورۃ النصر کے ذریعے یہ خوش خبری دی تھی کہ لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق شامل ہوں گے اور اللہ کے حکم سے ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی سلطنت روم اور ایران تک پھیل چکی تھیں اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ مسلمانوں کی کامیابیوں اور دین اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے دشمنانِ اسلام خصوصاً یہودیوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے تھے ان ہی یہودیوں سے ایک فطین ذہن رکھنے والے یہودی

عالم عبداللہ بن سبا نے بڑی چالاکی و ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمان اسے خصوصی درجہ دیں گے جس کا وہ فائدہ اٹھا سکے گا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ عبداللہ بن سبا جس نے اپنے پیش رو یہودی عالم ساؤل (پولوس) کی تقلید کرتے ہوئے یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا جس کا مقصد ہی اسلام میں اختلاف و انتشار پیدا کر کے فتنہ و فساد برپا کرنا تھا اسی لئے اس نے پولوس کا طریقہ کار اپناتے ہوئے امت کے ایسے گروہوں کو منتخب کیا جو دین کی معلومات میں کسی قدر کمزور تھے۔ ان کے سامنے ان کی محبوب و مقدس شخصیت (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں غلو اور اختراع کا رویہ اختیار کیا اور انہیں قائل کیا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ آ سکتے ہیں تو پھر سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہیں آ سکتے جبکہ وہ امام الانبیاء ہیں افضل و اعلیٰ ترین ہیں۔ اس نے یہ بات کم علم اور ناتجربہ کار لوگوں کے سامنے رکھی جنہوں نے اپنی عقیدت و احترام کے باعث اس کی ان خرافات کو قبول کر لیا۔ عبداللہ بن سبا نے جزیرہ نما عرب سے دور مصر کو اپنی کارستانی کے لئے منتخب کیا تھا کیونکہ عرب کے لوگ تو دین اسلام اور اس کی باریکیوں تک سے واقف تھے اس لئے ان پر تو اس کا جادو چل نہیں سکتا تھا اسی لئے اس نے ایک اور شوشہ چھوڑا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی قرابت دار ہستی کے طور پر پیش کرنے لگا جب لوگوں نے اس کے اس جھوٹ کو بھی تسلیم کر لیا تو اس نے پھر ایک اور حربہ اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت آزمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت و امامت اور حکومت کی سربراہی کا حق دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تھا۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوا ہے اور وصی ہی نبی کے بعد اس کی جگہ امامت کا سربراہ ہوتا ہے اور رسول اللہ کے وصی حضرت علی رضی

اللہ عنہ تھے۔ اس لئے وہی حکومت کے اور امامت کے سب سے پہلے حق دار تھے۔ عبداللہ بن سبا بڑی ہوشیاری سے اپنی سازش کے جال بُنتا چلا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی تمام کارروائیوں کو بڑی خوبی اور احتیاط سے خفیہ رکھا ہوا تھا اور خفیہ طور پر اسے بڑی پذیرائی اور کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے اس فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے حامیوں کو یہ بتانا شروع کیا۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور امت میں پیدا ہونے والے بگاڑ کی اصلاح کے لئے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے عمال کی وجہ سے امت میں پیدا ہو گئے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ اس نے اپنی یہودی فطرت و مکر وفریب کے ذریعہ مصر میں دو خفیہ تحریکیں قائم کر لی تھیں اور اس کے ساتھ ہی قرب و جوار کے علاقوں تک اس کے اثرات پھیلنے لگے تھے۔ وہ ان تمام لوگوں کو لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کے لئے مدینہ پہنچ گیا۔

یہودی عالم ساؤل جس نے عیسائیت کو نقصان پہنچانے کے لئے نا صرف اپنا دین تبدیل کیا تھا بلکہ اپنا نام بھی ساؤل سے بدل کر پولوس رکھ لیا تھا بالکل ایسے ہی عبداللہ بن سبا نے کیا۔ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے ورغلانے اور دین اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے اس نے بھی بظاہر یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اپنی سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلمانوں کو دو فرقوں میں تقسیم کر دیا اور ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین عبداللہ بن سبا اور اس کے چیلوں کی سازشوں کے باعث ہی لڑی گئیں۔ اس نے اس کشیدہ فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوفہ دارالحکومت منتقل کرا لیا۔ (الفصل فی الملل والنحل۔ ابن حزم۔ الملل والنحل' شہرستانی' البدایہ والنہایہ' ابن کثیر' تاریخ الامم والملوک' ابن جریر طبری۔ تحفہ اثنا عشری۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی)

عبداللہ بن سبا کی شخصیت بڑی متنازع تھی۔ اس کے کئی نام مشہور ہیں۔ ابن سودا' ابن

حرب اور ابن وہب اس کے بارے میں انتہا پسندانہ روایات مشہور ہیں۔ یہ یہودی النسل تھا اور اسلام کے ابتدائی دور کے بہت سے فتنوں کا محرک بھی تھا۔ بعض مصنفین نے اسے شیعہ مسلک کا بانی قرار دیا ہے لیکن شیعی مصنفین کے نزدیک یہ درست نہیں۔

حضرت عثمانؓ کے دور میں اسلام قبول کیا جب اس کو یہاں پذیرائی اور توجہ نہیں ملی تو وہ دمشق پہنچا لیکن وہاں کے لوگوں نے اس کے خیالات اور افکار کے باعث اسے وہاں سے نکال دیا۔ تب وہ مصر چلا گیا اور وہاں اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور خود نبوت کا دعوے دار تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے اس کا عقیدہ تھا کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ اٹھائے گئے ہیں۔

ابن علی نے اپنی کتاب ''چال'' میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سبا کو جس قدر بھی کہا جا سکے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ ملعون ہے۔ اگرچہ شیعہ علماء اور مصنفین ہمیشہ اس کی مذمت کی کرتے رہے ہیں۔ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا)

ذیل میں قارئین کی دلچسپی و معلومات کے لیے ان فرقوں کے صرف نام تحریر کئے جا رہے ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اثناء عشری مسالک کے چھ گروہ۔

(۱) رافضیہ (۲) خارجیہ (۳) جبریہ (۴) قدریہ (۵) جہیمہ (۶) مرجیہ۔

(۱) رافضیہ فرقے کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔

(۱) علویہ۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کہتے ہیں

(۲)۔ اجریہ۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شریک نبوت سمجھتے ہیں۔

(۳)۔ شیعہ۔ ان کا کہنا ہے جو شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام صحابہ سے افضل نہ سمجھے وہ کافر ہے۔

(۴)۔اسحاقیہ۔ان کے قیاس کے مطابق نبوت ختم نہیں ہوئی۔

(۵)۔زیدیہ۔ان کے مطابق نماز کی امامت سوائے اولادِ علیؓ کے کوئی اور نہیں کرسکتا۔ زید بن الحسن کی امامت کے قائل ہیں اور اجتہاد اور خروج بالسیف کو شرط امامت مانتے ہیں۔

(۶)۔عباسیہ۔یہ عباسؓ بن عبدالمطلب کے سوا اور کسی کو امام نہیں مانتے۔

(۷)۔امامیہ۔جو زمین کو امام غیب سے خالی نہیں مانتے اور نماز صرف بنی ہاشم کے پیچھے ہی پڑھتے ہیں۔

(۸)۔نادسیہ۔جو کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسرے پر فاضل جانے وہ کافر ہے۔

(۹)۔متناسخیہ۔ان کے خیال کے مطابق جب جان انسانی قالب سے نکل جاتی ہے تو اسے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے قالب میں چلی جائے۔

(۱۰)۔الاغیہ۔یہ لوگ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ‘ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تبرا (لعن طعن کرنا) کرتے ہیں۔(نعوذ باللہ)

(۱۱)۔راجعیہ۔ان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔

(۱۲)۔مرتضیہ۔یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا جائز ہے۔

(۲) خارجیہ فرقے کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔

(۱)۔ازراقیہ۔ان کے مطابق خواب میں کوئی شخص نیکی نہیں دیکھتا کیونکہ وحی منقطع ہو چکی ہے۔

(۲)۔ریاضیہ۔یہ کہتے ہیں کہ ایمان‘ قولِ صالح‘ عمل صالح‘ نیت اور سنت ہے۔

(۳)۔تغلبیہ۔ان کے قیاس میں ہمارے کام اللہ تعالیٰ کی خواب میں حاصل ہوتے ہیں نہ کہ اس کی قدرت اور خواہش سے۔

(۴)۔خازمیہ۔ان کے خیال میں فرضیت ایمان معلوم نہیں ہوئی۔

(۵)۔خلفیہ۔ کہتے ہیں کہ کفار کے مقابلے سے بھاگنا اگر وہ دو چند بھی ہوں تو کفر ہے۔

(٦)۔کوزیہ۔ان کے قیاس میں سوا زیادہ ملنے سے بدن پاک نہیں ہوتا۔

(٧)۔کنزیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

(٨)۔معتزلہ۔ کے مطابق شر تقدیر الٰہی سے نہیں ہے اور نماز کی امامت فاسق سے جائز نہیں ہوتی اور ایمان کسب بندہ سے ہے اور قرآن مخلوق ہے اور مُردوں کو دعا اور صدقے سے کوئی فائدہ یا نفع نہیں ہوتا۔ معراج النبی بیت المقدس سے آگے ثابت نہیں۔ حساب کتاب ومیزان کچھ نہیں ہے اور فرشتے مومنین سے افضل ہیں اور قیامت کے روز دیدار الٰہی نہیں ہوگا اور کرامتِ اولیا کوئی چیز نہیں' اہل جنت کے لیے سونا اور مرنا ہے۔ مقتول اپنی موت نہیں مرتا' قیامت کی علامات یعنی دجال وغیرہ کچھ نہیں ہیں۔ مرتکب زنا کو ایمان سے خارج جانتے ہیں (اصول کافی)

(٩)۔میمونیہ۔ کے مطابق ایمان بالغیب باطل ہے۔

(١٠)۔محکمیہ۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خلقت پر کوئی حکم نہیں ہے۔

(١١)۔سراجیہ۔ کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے احوال ہمارے لیے حجت نہیں ہیں بلکہ ان کا انکار کرنا واجب ہے۔

(١٢)۔خنسیہ۔ کہتے ہیں کہ بندے کو اعمال کی جزا نہیں ملتی۔

(٣)۔جبریہ فرقے حسب ذیل ہیں۔

(١)۔مضطربہ۔ کے مطابق تمام خیر وشر اللہ کی جانب سے ہے بندے کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

(٢)۔افعالیہ۔ کے کہنے کے مطابق بندہ فعل تو کرتا ہے مگر اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔

(٣)۔معیہ۔ کہتے ہیں کہ انسان کے لیے فعل قدرت ہے لیکن اسے وہ طاقت

وقدرت اللہ نے نہیں دی۔

(۴)۔تارکیہ۔ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد کوئی اور چیز فرض نہیں ہے۔

(۵)۔بخشیہ۔ کہتے ہیں ہر شخص اپنا حصہ کھاتا ہے اس لیے کسی کو کچھ دینا ضروری نہیں ہے۔

(۶)۔متمنیہ۔ کہتے ہیں کہ خیر وہ خیر ہے جس سے دل تسلی پائے۔

(۷)۔کستارینہ۔ثواب وعذاب عمل سے زیادہ نہیں ہوتا۔

(۸)۔حبیہ۔ کہتے ہیں کہ دوست اپنے دوست کو ہرگز عذاب نہیں دیتا۔

(۹)۔خوفیہ۔ کہتے ہیں کہ دوست ہرگز نہیں ڈرتا۔

(۱۰)۔فکریہ۔ کہتے ہیں کہ معرفتِ حق میں فکر کرنا عبادت سے بہتر ہے۔

(۱۱)۔حسبیہ۔ کہتے ہیں کہ عالم میں قسمت نہیں ہے۔

(۱۲)۔حجتیہ۔ کہتے ہیں کہ جب کام اللہ کی تقدیر سے ہوتے ہیں تو بندے پر کوئی حجت نہیں ہے جس کے سبب وہ گرفتار ہو۔

(۴)قدریہ فرقہ۔ یہ وہ فرقہ ہے جو انسان کو اپنے افعال پر قادر مانتا ہے اور عقیدے میں جبریہ فرقے کی ضد ہے شیعہ ان دونوں کے درمیان ہیں (شافی اصول کافی)

قدریہ فرقے حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔احدیہ۔ کے مطابق انہیں صرف فرض کا اقرار ہے اور سنت سے وہ انکار کرتے ہیں۔

(۲)۔ثنویہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ہر نیکی یزدان سے ہے اور ہر برائی اہرمن سے ہے۔

(۳)۔کیسانیہ۔ان کے مطابق ان کے اعمال مخلوق ہیں۔

(۴)۔شیطانیہ۔ان کے مطابق شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

(۵)۔شریکیہ۔ان کے مطابق ایمان غیر مخلوق ہے جو کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔

(۶)۔ وہمیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا۔

(۷)۔ رویدیہ۔ ان کے خیال میں امام کے ساتھ لڑنا جائز ہے۔

(۸)۔ اسماعیلیہ۔ اسے فرقہ باطنیہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ امام باطن کے قائل ہیں۔

(۹)۔ ستبریہ۔ ان کے عقیدے کے مطابق گنہگار کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

(۱۰)۔ قاسطیہ۔ ان کے مطابق علم، مال، حکمت وریاضت کا حاصل کرنا فرض ہے۔

(۱۱)۔ نظامیہ۔ ان کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کو شے کہنا جائز ہے۔

(۱۲)۔ متوفیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ شر مقدر ہے کہ نہیں۔

(۵)۔ جہمیہ فرقے حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔ معطلیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق ہیں۔

(۲)۔ مترابعیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ علم قدرت اور مغیت مخلوق ہیں مگر خالق غیر مخلوق ہے۔

(۳)۔ متراقبیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ مکان میں ہے۔

(۴)۔ واردیہ۔ یہ کہتے ہیں جو دوزخ میں جائے گا وہ پھر وہاں سے باہر نہیں نکلے گا اور مومن دوزخ میں نہیں جائے گا۔

(۵)۔ حرقیہ۔ ان کے خیال میں اہلِ دوزخ ایسے جلیں گے کہ ان کا نشان تک بھی دوزخ میں نہیں رہے گا۔

(۶)۔ مخلوقیہ۔ ان کے کہنے کے مطابق قرآن، توریت، زبور اور انجیل سب کے سب مخلوق ہیں۔

(۷)۔ عبریہ۔ یہ کہتے ہیں کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) صرف ایک عاقل وحکیم شخص تھے وہ رسول نہیں تھے۔

(۸)۔ فانیہ۔ ان کے خیال کے مطابق جنت ودوزخ دونوں فنا ہو جائیں گی۔

(۹)۔زنادقیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ معراج روح سے ہوا تھا نہ کہ بدن سے۔ اللہ کو دنیا میں دیکھ سکتے ہیں' یہ عالم قدیم ہے اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔

(۱۰)لفظیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ قرآن قاری کا کلام ہے کلامِ الٰہی نہیں ہے۔

(۱۱)۔قبریہ۔ یہ عذاب قبر کو نہیں مانتے اس کے منکر ہیں۔

(۱۲)۔واقفیہ۔انہیں قرآن قاری کے مخلوق ہونے کے بارے میں توقف ہے۔

(۶)مرجیہ۔اس فرقے والے ایمان کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور عمل کو ایمان نہیں مانتے خواہ وہ عمل دل سے ہو یا ظاہر سے اور ایمان میں قوت وضعف کا کوئی فرق نہیں کرتے ان کے نزدیک بد سے بد آدمی کو بھی جبرئیل کے مرتبے کے برابر مانتے ہیں۔(الشافی اصولِ کافی)

(۶)۔مرجیہ فرقے حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔تارکیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد اور کوئی چیز فرض نہیں ہے۔

(۲)۔شائیہ۔ان کے خیال میں جس شخص نے کلمہ لا الہ الا اللہ کہا وہ جو چاہے کرے اس پر کوئی عذاب کوئی پکڑ نہیں ہے۔

(۳)۔راجیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ بندہ اطاعت سے مقبول اور معصیت سے عاصی نہیں ہوتا۔

(۴)۔شاکیہ۔یہ اپنے ایمان میں شک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح ہی ایمان ہے۔

(۵)۔نہمیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایمان علم ہے جو شخص جمیع اوامر ونواہی کو نہیں جانتا پس وہ کافر ہے۔

(۶)۔عملیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایمان عمل ہے۔

(۷)۔منقوصیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ۔

(۸)۔مستثنیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم انشاءاللہ تعالیٰ مومن ہیں۔

(۹)۔اثریہ۔ یہ کہتے ہیں کہ قیاس باطل ہے اور صلاحیت دلیل نہیں رکھتا۔

(۱۰)۔ بدعیہ۔ کہتے ہیں کہ امیر کی اطاعت واجب ہے چاہے وہ معصیت کا ہی حکم کیوں نہ ہو۔

(۱۱)۔ مشبہہ۔ یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔

(۱۲)۔ حشویہ۔ یہ کہتے ہیں کہ واجب' سنت اور مستحب سب ایک برابر ہیں۔

ان فرقوں کے علاوہ خود فقہ حنفی میں بھی برصغیر پاک وہند میں دو فرقے اہل سنت و الجماعت بہت معروف ہیں۔

(۱) دیوبند۔ اس مکتبہ فکر کے لوگوں کا تعلق دیوبند کی درس گاہ سے ہے جسے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا اس درس گاہ کے ایک طالب علم جو اپنے کمال علم سے حکیم الامت بنے وہ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ تھے۔ دیوبند ان کے اقوال وافعال کی پیروی کرتے ہیں۔ اور درس گاہ دیوبند کے طریقہ کو اپناتے ہیں۔ (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے)

(۲)۔ بریلوی۔ اس مکتبہ فکر کے لوگ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ قادری کی پیروی کرتے ہیں۔ انہوں نے بریلی میں جامعہ منظر الاسلام کی بنیاد ڈالی جہاں دینی تعلیمات کا اہتمام کیا۔ ان کے مخالفین کا خیال ہے کہ انہوں نے دین اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی ہے لیکن ان کے پیروں کاروں کے مطابق انہوں نے صرف مسالک اربعہ کے تحفظ کی کوشش کی ہے اس جماعت کو حضرت احمد رضا خان بریلویؒ سے عقیدت کے باعث بریلوی کہا جاتا ہے۔

دراصل بریلوی تحریک کا آغاز 1920ء میں ہوا جب گاندھی نے تحریک ترک موالات کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی تو اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی نے اس سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اس اتحاد کے مضمرات سے آگاہ کرنے کی ابتداء کی اور

جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس کے بعد ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی جس کا دوسرا نام ''جمہوریت اسلامیہ مرکز'' رکھا گیا تھا۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی بریلوی تحریک زوروں پر آ گئی اور آل انڈیا سنی کانفرنس میں 30 اپریل 1946ء کو مطالبہ پاکستان کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

سیاسی محاذ سے قطع نظر بریلوی تحریک ایک مسلک کے طور پر بھی نمایاں ہو کر ابھری۔ بریلوی حضرات کے نزدیک آزاد خیالی' فطرت پسندی اور سائنٹیفک طرز فکر مردود ہے وہ ندوۃ العلماء' دیوبند اور علی گڑھ جیسی تمام تحریکوں کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ بریلوی حضرات کے نزدیک وہابی' دیوبندی' نجدی' مسالک کے لوگ ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں اہل سنت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی مسالک ایک ہیں۔ ان میں صرف فروعی مسائل کا اختلاف ہے۔

بریلوی عقائد سے دیگر مسلمان اور خصوصاً دیوبندی عقائد والوں کو اختلاف ہے جن اعمال کو بریلوی جزو ایمان اور عین ایمان سمجھتے ہیں دوسرے انہیں بدعتیں کہتے ہیں اور قابل مذمت سمجھتے ہیں۔

بریلوی اعلیٰ حضرت احمد رضا خان کی تقلید کے قائل ہیں ان کے عقائد میں توحید سے مراد اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کے محبوب پیغمبر آخر الزماں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی عزت وعظمت کرنا اور انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کا مظہر وآئینہ ہیں۔ آواز ان کی ہوتی ہے اور کلام اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ صوفیا اور اولیا امت کے ستون ہوتے ہیں۔ چالیس ابدال ہر وقت دنیا میں موجود رہتے ہیں جو آنے والی آفتوں کو ٹالتے رہتے ہیں ان کے ذریعے خلق کی حیات روزی اور تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔

ان کے نزدیک جائز امور میں بلند آواز سے درود شریف پڑھنا یا ذکر کرنا' اولیاء اللہ

کے مزارات پر حاضری دینا' نیاز دینا' ان سے مدد مانگنا' ایصال ثواب کرنا' بدنی اور مالی عبادات دوسرے مسلمانوں کو بخشنا' فاتحہ' تیجہ (سوئم) چالیسواں وغیرہ کرنا۔ میت کے لیے دعا کرنا نماز جنازہ سے پہلے اور تدفین کے بعد' جنازے کے آگے کلمہ شہادت یا درود شریف پڑھنا' میت کے ساتھ بزرگان دین کے تبرکات مثلاً غلاف کعبہ' عہدنامہ یا شجرہ وغیرہ رکھنا اور تدفین کے بعد قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر اذان دینا' پختہ قبر بنانا' اولیاء و مشائخ کے مزارات تعمیر کرنا' قبر پر پھول چڑھانا' چراغ' اگربتی جلانا۔ اولیاء کرام کے نام پر جانور پالنا۔ گیارہویں شریف کرنا' اولیاء کرام کا عرس کرنا' قوالیاں کرانا' اپنے بزرگوں کی برسی کرنا وغیرہ اور بہت سے ایسے اعمال ہیں جن پر دیگر مسالک میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

فقہ جعفریہ اور بریلوی مسلک میں کئی معاملات میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ بریلوی مسلک میں دنیا میں چالیس ابدال کا موجود ہونا بریلوی مسلک میں اولیاء کرام کی عزت و تعظیم انتہائی درجہ پر کرنا جس طرح فقہ جعفریہ میں اماموں کی توقیر کی جاتی ہے۔ ایام محرم دونوں اپنے اپنے طریقوں سے مناتے ہیں۔ نیاز و نذر دونوں مسالک میں رائج ہے۔ ایک اولیاء کرام اور بزرگان دین کے لئے کرتے ہیں تو دوسرے امام کے لئے کرتے ہیں۔ کونڈے کی نیاز محرم میں سبیل و شربت دونوں مسالک میں مشترک ہے۔

اسلامی فقہ کی تشکیل میں بہت سے اکابر' مجتہدین اور آئمہ کا حصہ ہے' ان میں بہت سے اب بالکل گم نام ہو چکے ہیں اور بعض کے اسمائے گرامی صرف علما تک محدود ہیں۔ اسلام کی تاریخ بہت سے علمی معجزات پر مشتمل ہے تدوین حدیث و فنِ اسماء الرجال یعنی راویانِ حدیث پر جرح و تحقیق' حدیث کی اقسام راویوں کے انواع و درجات حدیث کی تخصیص' تعین' تحدید' اصول حدیث' تدوین حدیث و تخریج' تفریع کے اصول' کتاب و سنت کے عام و خاص اور ناسخ و منسوخ قیاس' استحسان یہ سب کی سب چیزیں کسی علمی معجزے اور تحقیق سے کم نہیں۔

عہد مابعد کی چار مشہور و معروف ہستیاں یعنی امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کی فقہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں رواج پا گئی ۔ اور عالم اسلام نے ان کی تقلید اور اتباع کی ۔ ان آئمہ اربعہ یعنی چاروں اماموں میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنے تفقہ و شان اجتہاد و استنباط اور ملکہ تخریج و تفریع اور قیاس و رائے میں سب سے الگ اور ممتاز ہیں ۔ مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی مقلد ہے ۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ فقہ حنفی دیگر ائمہ کے فقہوں کے مقابلے میں اپنے اصول' گہرائی' لچک وسعت اور رخصتِ سہولت کے اعتبار سے نہایت آسان ہے یہ امام اعظمؒ کا اتنا بڑا فکری اور علمی کارنامہ ہے جسے دنیائے اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکے گی ۔

آئندہ صفحات میں امام اعظمؒ کے فقہ کے متعلق چیدہ چیدہ فقہی مسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ امام اعظمؒ کا فقہی کام اور کارنامے اس قدر ہیں کہ کسی مختصر کتاب میں سمیٹے نہیں جا سکتے ۔ اس سے قبل کہ ہم امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کے بارے میں کچھ تحریر کریں ضروری ہے کہ قارئین یہ جان اور سمجھ لیں کہ تقلید' اجتہاد اور خود فقہ ہے کیا اور اس کی ضرورت اہلِ اسلام کو کیوں محسوس ہوئی ۔

تقلید

تقلید کسی ایسے قول کی پیروی کرنے کو کہتے ہیں جس کی دلیل و حجت سے مقلد یعنی پیروی کرنے والا واقف نہ ہو۔ یعنی انسان کسی دوسرے کے قول وفعل کو درست مان کر کسی دلیل وتامل کے بغیر اس کا اتباع یعنی پیروی کرے۔ تقلید اجتہاد کی ضد ہے۔

اتباع اور تقلید میں بہت ہی باریک سا فرق ہے۔ اتباع میں پیروی سوچ سمجھ کر اس کے اغراض ومقاصد سے واقف ہو کر کی جاتی ہے جبکہ تقلید کی روح محض حسن ظن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تقلید کی ابتداء اُس زمانے میں ہوئی جس زمانے میں مسالک فقہ کی تدوین ہوئی حالانکہ ایسا نہیں' کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور سے اس کی ابتداء ہو چکی تھی' کیونکہ تمام صحابہ کرام مجتہد نہ تھے جو مجتہد نہ تھے وہ مجتہد صحابہ کے مقلد تھے۔ تقلید کے اسباب میں اہم ترین سبب مجتہدانہ صلاحیتوں کا فقدان ہے تیسری صدی کے بعد جب اجتہاد قطعی ختم ہو گیا۔ فقہائے متاخرین اور عوام کے لیے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اکابرین متقدمین کی تقلید کے قائل ہو جائیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تقلید کی دو اقسام بیان فرمائی ہیں۔

(۱) تقلید واجب (۲) تقلید حرام

تقلید واجب یہ ہے کہ جب اگر کوئی شخص کتاب وسنت سے ناواقف ہو اور تتبع یعنی نقل یا پیروی سے ناواقف ہو اور استنباط یعنی کسی بات سے بات نکالنا بھی نہ جانتا ہو تو اسے چاہیے کہ کسی متقی عالم سے پوچھ لے کہ فلاں سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے اور جب اسے معلوم ہو جائے تو اس پر عمل کرے۔ یہ عمل کرنا تقلید واجب اور جائز ہوگا۔ اس قسم کی

تقلید میں یہ ضروری ہے کہ کسی مجتہد کے قول پر اس شرط پر عمل کیا جائے۔ جبکہ وہ سنت کے مطابق ہو اور پھر اگر اسے تحقیق کرنے پر معلوم ہو جائے کہ وہ قول سنت کے مطابق نہیں ہے تو اسے چھوڑ دے اور حدیث کے مطابق عمل کرے جیسا کہ خود امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے اگر میری کوئی بات حدیث سے ٹکراتی ہو تو اسے پتھر پر دے مارو یعنی فوراً چھوڑ دو۔

تقلید حرام۔ اگر قطعی حجت مل جانے کے باوجود کوئی ایسا عمل یا کسی کی پیروی کی جائے جو خلاف سنت اور خلاف شریعت ہو تو ایسی تقلید ممنوع ہے اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں۔

وجوب تقلید کی تائید میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ صرف قرون اولیٰ کے فقہا میں ہی حقیقی نظر تیز فہم اور وسعت نظر وسعت علم اور درایت پائی جاتی تھی جو مسائل کے فقہی حل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ وہی لوگ ان مسائل کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے قائم کرسکتے تھے یعنی آئمہ اربعہ ہی اس معیار وکسوٹی پر پورے اترتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

اجتہاد

اجتہاد ایسی کوشش کو کہا جاتا ہے جو فقہ کے مسائل حل کرنے اور کوئی حکم شرعی تلاش کرنے کے لیے قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئی رائے قائم کی جائے۔ یعنی جب کسی مسئلے کا حل قرآن وسنت سے نہ ملے تو اسلامی احکامات اور صراط مستقیم کے پیش نظر قیاس لگانے اور ظن غالب قائم کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اجتہاد کیا ہے؟ مجتہد کون ہے اور مقلد کسے کہتے ہیں؟ ذیل میں مختصراً ان تینوں کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اجتہاد اس کوشش کا نام ہے جب کسی مسئلے کا حل قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ملے تو اسلامی احکامات اور صراط مستقیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے قاضی وقت اپنی رائے کے مطابق مسئلے کو حل کرے۔

(۱) کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے عین مطابق ہے۔

(۲) اجتہاد حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں (آئندہ صفحات میں حدیث منقول ہے) بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو فیصلہ کرنے کے منصب پر فائز ہو۔ یعنی قاضی یا امام کے لیے اجتہاد سے کام لینا عین اسلام کے مطابق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے۔

اگر کوئی قاضی اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں (ایک صحیح ہونے کا دوسرا اجتہاد کا اور اگر وہ اجتہادی فیصلے میں غلطی کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا صرف اجتہاد کا' (ابوداؤد) اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حکام قضاۃ کو اجتہاد کی ترغیب دیتے ہیں اور خطا کے خوف سے بے پرواہی کر کے ایک اجر کی بشارت دیتے ہیں۔

اجتہاد دراصل ایک فن ہے جس کے کچھ اصول مرتب ہیں اس کا ایک فنی پہلو یہ ہے کہ مجتہد قرآن وسنت، اصول فقہ، اقوال، فیصلوں اور آراء سے پوری طرح باخبر ہو اور جانتا ہو کہ الفاظ میں اشتراک معنی کس طرح ہوتا ہے اور ایک ہی بات سے مختلف مفہوم کیوں کر نکالے جاسکتے ہیں اور وہ عبارت آرائی کے حسن سے بھی پوری طرح واقف ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین جس راہ پر چلے اور حکومت کے معاملات چلائے وہ اجتہاد کا ہی راستہ تھا جب انہیں قرآن وسنت سے کوئی راہ نہ ملتی تو وہ اجتہاد سے ہی کام لیتے تھے۔

مولانا رئیس احمد اپنی کتاب سیاست شرعیہ میں لکھتے ہیں کہ اجتہاد اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو مختصر سے عرصے میں دنیا پر حکمرانی حاصل کرادی۔

مولانا جعفر شاہ پھلواریؒ اپنی کتاب ''اجتہادی مسائل'' میں ایک سوال۔ کیا اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر کس و ناکس کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اجتہاد وہی لوگ کریں گے جو اس دور کے ارباب حل وعقد ہوں اور وہ حل وعقد بھی ان ہی مسائل کے ہوں جن میں اجتہاد مطلوب ہو۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اجتہاد کا حق صرف مولوی کو ہی حاصل ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک تحریر قاضی شریح کو لکھی۔ 'اے شریح! تم کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اگر وہاں نہ ہو تو سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلے کرو۔ اگر ان دونوں میں بھی نہ ہو تو صالحین کے فیصلوں کے مطابق کرو۔ اور اگر صالحین کے فیصلے بھی نہ ہوں تو خواہ بروقت خود ہی فیصلہ کرلو یا ذرا غور وفکر کے بعد کرو۔ میری رائے میں تمہارے لیے غور وفکر کرلینا بہتر ہے۔''

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فرمان سے جو بات واضح ہو رہی ہے وہ کچھ اس طرح

سے ہے۔

(۱) قرآن حکیم کو ہر حال میں مقدم رکھنا چاہئے۔

(۲) قرآن کریم کے بعد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہئے۔

(۳) اگر سنت میں بھی حل نہ ہو تو صالحین کے فیصلوں سے استفادہ کرنا چاہئے

(۴) اپنے غور وفکر کو کام میں لانا چاہئے۔

(۵) اجتہاد میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔

(۶) اگر کہیں سے کوئی حل نہ ملتا ہو تو اپنے قیاس سے کام لے کر اجتہاد کرنا چاہئے۔

(۷) اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

جس دور میں اجتہاد کا دروازہ بند کیا گیا۔ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ اختلاف و تضادات پیش تھے۔ کم علم و فہم کا ہر شخص مجتہد بن کر گمراہی پھیلا رہا تھا ایسی حالت میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے سے امت بڑے انتشار سے بچ گئی۔

مجتہد: دینی مسائل میں اجتہاد کرنے والے شخص کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی شخص کو اس کی دینی بصیرت اور علم کی وجہ سے مسلمان اسے اس مرتبے پر فائز کرتے ہیں۔ بعض اوقات حکومت کسی شخص کو مقرر کر دیتی ہے۔ اہل سنت آئمہ اربعہ کو مجتہد مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے فقہی مسائل میں اجتہاد کیا تھا۔ شیعہ حضرات ہر زمانے میں اپنے لیے ایک مجتہد مقرر کرتے ہیں اس کی رائے اہل تشیع کے لیے حتمی ہوتی ہے۔ اجتہاد ہر شخص کے لیے جائز نہیں۔ اجتہاد کرنے کے لیے ان مخصوص صلاحیتوں کا ہونا لازمی ہے جو مجتہد کو اس قابل بنائیں۔ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب الرائے ہو۔ صاحب فراست اور انصاف پسند اور پاکیزہ اخلاق کا مالک ہو اور احکام کو سمجھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو یعنی دلائل شرعیہ اور استنباط احکام کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو۔ تفسیر قرآن۔ ناسخ و منسوخ کی حقیقت کو پوری طرح

سمجھتا ہواور مقاصد شریعت سمجھنے کی مہارت رکھتا ہو۔ مجتہدین کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ تقریباً چار اقسام معروف ہیں۔

مقلد: مسلمانوں کا ایسا گروہ جو یہ سمجھتا ہو کہ چاروں اماموں کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اوران میں علماء بھی شامل ہوں ان کے لیے چاروں آئمہ فقہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام شافعیؒ اورامام احمد بن حنبلؒ میں سے کسی ایک کی تقلید یعنی پیروی کرنا واجب ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں دولت عباسیہ کے آخری دور میں اجتہاد کا جوش وخروش کم ہو گیا۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی میں ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوط بغداد کے بعد علمائے اہل سنت نے مذہب میں بے جا قطع و برید کے خوف سے باتفاق رائے اجتہاد کو موقوف کرنے اور صرف چار مسالک کا اتباع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عربی ثقافت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی چلی گئی جس کے باعث تقلید کا عام رواج ہو گیا اور فقہی اجتہاد ختم ہو گیا اور مسلمان اوہام پرستی' بے بنیاد معتقدات میں الجھتے چلے گئے جس کے باعث مسلمانوں کا زوال انتہا کو پہنچ گیا (الاحکام۔ آمدی) اس وقت ہر شخص جسے علم فقہ پر دسترس بھی نہیں ہوتی تھی چند سنی سنائی باتوں کے حوالے سے بغیر کافی علم و دانش کے اپنی رائے فقہ میں داخل کرنے لگا اس طرح مذہب میں انتشار کا خطرہ پیدا ہونے لگا تب ہی علمائے کرام نے فیصلہ کیا اور ائمہ اربعہ کی رائے کو حرف آخر ماننے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح آئمہ اربعہ کے اجتہاد کو اسلامی فقہ میں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ مقلد یا مقلدین کے مقابلے میں دوسرا گروہ غیر مقلدین کا ہے جو آئمہ اربعہ کی فقہ اور اجتہاد کو تسلیم نہیں کرتا اور براہ راست احادیث سے مسائل کا استنباط کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

فقہ کیا ہے؟

اسلامی نظام اور معاشرے کے قیام کے لیے یہ بہت ضروری اور اہم بات ہے کہ ہر طرح کی قانون سازی اور معاملات کے حل کے لیے کتاب اللہ یعنی قرآن کریم سے رجوع کیا جائے اس کے بعد سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ سے اور اگر کبھی کسی نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ روش اختیار کی یا اپنی رائے کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر مقدم جانا تو اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا مالک و آقا بڑی قوت والا اقتدار والا ہے جو ہماری ہر بات ہماری نیتوں کے حال تک سے پوری طرح واقف ہے۔ اسلامی نظام حیات اور قوانین کے نفاذ و اصلاح کے لیے ایک حدیث مسند احمد' ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ سے درست اسناد کے ساتھ منقول ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم عدالت بنا کر بھیج رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ ''تم کس چیز کے مطابق فیصلے کرو گے؟'' انہوں نے عرض کیا'' کتاب اللہ کے مطابق۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دریافت فرمایا۔ ''اگر کتاب اللہ میں کسی معاملے کا حکم نہ ملے تو کس چیز کی طرف رجوع کرو گے؟'' انہوں نے عرض کیا۔'' سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔'' اگر اس میں بھی کچھ نہ ملے تو؟'' انہوں نے کہا پھر میں خود اجتہاد کروں گا۔'' اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ '' شکر ہے اللہ کا جس نے اپنے رسولؐ کے نمائندے کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق بخشی جو

اس کے رسول کو پسند ہے۔'' (ترمذی۔ ابوداؤد) نبی کریم کی حدیث سے ہی اجتہاد کی راہ ہموار ہوئی جو آگے چل کر فقہ کی بنیاد بنی۔

امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ جب کوئی مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے نہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تو میں اقوال صحابہ پر غور کرتا ہوں اور اقوال صحابہ کے سامنے کسی کے قول کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ ہمارا علم رائے ہے میرے نزدیک یہی سب سے بہتر ہے جو شخص اس کے علاوہ کسی اور رائے کو بہتر سمجھے تو اس کے لیے اس کی رائے اور ہمارے لیے ہماری رائے جس طرح مجھ سے پہلے حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی کرتا ہوں۔

لغوی اعتبار سے لفظ فقہ کے معنی فہم وادراک کے ہیں وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۝ (التوبہ۔۸۷) اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی معنی قرآن کریم میں کئی مقامات پر مذکور ہیں اور اصطلاح شرع میں فقہ مخصوص فہم سے حاصل کردہ اس علم کو کہتے ہیں جو قرآن حکیم اور سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ سے ماخوذ ہو۔ اصطلاح شرع میں فقہ کا لفظ علم دین کے لیے مخصوص ہے اس لیے علم فقہ کا عالم فقیہہ کہلاتا ہے۔ (بحرالرائق) علامہ زمخشریؒ نے فقہ اور فقیہہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے فقہ کے معنی شق اور فتح کے ہیں اور فقیہہ اس عالم کو کہتے ہیں جو قرآن وسنت کے احکام میں چھان بین کر کے ان کے حقائق معلوم کر کے اور مشکل مقامات کو کھول کر آسان کر دے۔ علماء فقہ کے نزدیک فقہ ان فروعی احکامِ شرعیہ کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہو۔ یعنی فقہ عدل وانصاف کا فن ہے اور احکام شرعی کا علم ہے اور اسلامی دین اور معاملات دونوں پر مشتمل ہے۔

علامہ ابن اثیرؒ نے بھی فقہ کی تعریف تقریباً ان ہی الفاظ میں کی ہے وہ تحریر کرتے ہیں کہ فقہ کے معنی کسی شے کو چیرنا اور کھولنا۔ عمومی طور پر اعمالِ شرعیہ کے مسائل کے علم کو علم فقہ کہتے ہیں۔ الفقہ علم بالمسائل الشرعیہ فقہیا' علم فقہ کی تعریف میں بیان کرتے ہیں۔ یہ ان فروعی

احکام شرعیہ کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہوں۔

ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''کشافِ اصلات الفنون'' میں امام ابوحنیفہؒ کی نسبت فقہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے وہ علم جس سے کل علوم دینیہ کی معرفت معلوم ہو۔ شافعی مسالک میں علم الفقہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ ''فقہ شریعت کے ان عملی احکام کا علم ہے جو تفصیل و دلائل سے ثابت ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ انتخاب حدیث میں بہت محتاط تھے۔ وہ صرف وہی احادیث قبول کرتے تھے جو باوثوق اسناد سے ثابت ہوتی تھیں۔

اسلامی علوم مثلاً تفسیر' حدیث' مغازی ان کی ابتدا اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہی ہوگئی تھی' لیکن اس وقت ان کو فن کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی تھی' کیونکہ وہ اس وقت تک کسی خاص شخصیت سے منسوب نہیں ہوئے تھے۔ پھر دوسری صدی کے اوائل میں تدوین و ترتیب شروع ہوئی اور جن لوگوں نے یہ تدوین' ترتیب کی وہی ان علوم کے بانی کہلائے' چنانچہ بانی فقہ کا لقب حضرت امام ابوحنیفہؒ کو ملا۔ درحقیقت وہ اس لقب کے حق دار بھی تھے اگر ارسطو کو علمِ منطق کا موجد مانا جاتا ہے تو بلاشبہ امام اعظم ابوحنیفہؒ علم فقہ کے موجد ہیں۔ امام صاحبؒ کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہی فقہ ہے۔

فقہ کی تاریخ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احکام کی قسمیں نہیں پیدا ہوئی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے سامنے وضو فرماتے تھے اور کچھ بتاتے نہیں تھے کہ یہ رکن ہے' یہ واجب ہے' یہ مستحب ہے' صحابہ آپ کو دیکھ کر اسی طرح وضو کر لیا کرتے تھے۔ ایسے ہی نماز میں بھی ہوتا تھا۔ یعنی صحابہ فرض واجب وغیرہ کی تفصیل و تدقیق نہیں کیا کرتے تھے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے وہ بھی ویسے ہی پڑھ لیا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے جو سب کے سب قرآن کریم میں موجود ہیں۔ البتہ جو واقعات غیر معمولی پیش آتے ان کے بارے میں لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جواب دیتے اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگ کوئی کام کر لیتے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تحسین فرماتے یا نارضامندی کا اظہار فرماتے۔ اس قسم کے فتوے عام مجمع میں ہوتے۔ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا پاس کرتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اسلامی فتوحات بہت وسعت کے ساتھ ہوئیں اور اسلامی تمدن کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور واقعات کثرت سے پیش آنے لگے اس لیے اجتہاد و استنباط کی ضرورت بھی بڑھ گئی اور اجمالی احکام کی تفصیل کی طرف رجوع ہونے لگا۔ مثلاً کسی شخص سے غلطی سے نماز میں کوئی عمل چھوٹ گیا یا اس نے ترک کر دیا تو پھر بحث پیش آتی کہ نماز ہوئی کہ نہیں ہوئی۔ اس بحث سے یہ فائدہ ہوا کہ نماز کے تمام اعمال وارکان پر تفصیل سے بحث ہوئی اور تفریق کرنا پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں' کتنے مسنون اور مستحب ہیں۔ تفریق کے لیے جو اصول وضع ہو سکتے تھے' اس پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین طویل بحث کے بعد بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو استنباط اور قیاس سے کام لینا پڑا۔ غرض صحابہ ہی کے زمانے میں احکام اور مسائل کے دفتر بن گئے اور جدا جدا طریقے قائم ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش مبارک میں بچپن سے ہی ہوئی تھی۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے وہ جس قدر باخبر اور باعلم تھے اتنا اور ایسا موقع کسی اور کو نہیں مل سکا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دیانت و قوتِ

استنباط بھی خوب عطا فرمائی تھی جس سے انہیں استخراج میں ملکہ حاصل ہوا۔ عموماً صحابہ کرام اس بات کا اعتراف کیا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تو قول تھا کہ اللہ نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علی رضی اللہ عنہ موجود نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ خود بڑے مجتہد تھے مگر وہ بھی کہا کرتے تھے کہ جب ہم کو علی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ مل جائے تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ صحابہ کرام میں جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا اور مجتہد و فقیہہ کہلائے ان میں چار بزرگ صحابی حضرات بہت مشہور ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ' حضرت علی کرم اللہ وجہہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان حضرات میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قیام زیادہ تر کوفہ میں رہا۔ وہیں ان کے احکامِ مسائل نے ترویج پائی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا تعلق حرمین شریفین سے رہا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حدیث و فقہ میں کامل تھے' کیونکہ ان کی تربیت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمائی تھی وہ جلوت وخلوت میں ہمدم و ہم راز رہے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کس باب میں اتری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے قیام کوفہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم کے لیے درس گاہ قائم کر لی تھی جس میں بہت سے شاگرد آیا کرتے جن میں سے اسودؒ عبیدہؒ حارثؒ اور علقمہؒ نے بہت نام وری پائی۔ علقمہؒ اور اسودؒ کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعیؒ مسند نشین ہوئے۔ انہوں نے مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار کیا تھا جس کا ماخذ حدیث نبوی حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتاوی تھے' یہ مجموعہ مرتب طور پر قلم بند نہیں ہوسکا۔ ان کے شاگردوں کو مسائل زبانی حفظ تھے۔ سب سے زیادہ یہ مجموعہ حمادؒ کے پاس جمع تھا جو ابراہیم نخعیؒ کے شاگرد تھے اور نخعی کے

مجموعہ فقہ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ استاد حضرت حمادؒ کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت امام ابوحنیفہؒ مسند نشین ہوئے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے بہت زیادہ مسائل مدون کیے اور زبانی روایت جن کی فنی حیثیت کچھ نہ تھی کو باقاعدہ تحریری شکل دی اور استنباط کے قواعد اور احکام اور تفریح کے اصول منضبط کیے کیونکہ پہلے نہ تو احادیث میں امتیاز و مراتب تھے نہ قیاس اور شبیہ والنظیر علی النظیر کے قاعدے مقرر تھے۔ انہیں مقرر کیا اور انہیں قانون کے رتبہ تک پہنچایا۔

امام ابوحنیفہؒ نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا کام شروع کیا تھا وہ نہایت وسیع اور پرخطر تھا اس لیے انہوں نے اس اتنے بڑے کام کے لیے صرف اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر انحصار نہیں کیا اس کام کے لیے انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کی جس میں تقریباً چالیس قابل و ذہین شاگرد شامل تھے جنہوں نے بعد میں بڑا نام کمایا۔ تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص مسئلے پر سب ارکان مجلس متفق الرائے ہو جاتے تو اسے قلم بند کر لیا جاتا اس سے پہلے اس مسئلے پر خوب آزادی سے بحث مباحثہ ہوتا امام صاحبؒ بہت غور و فکر اور تحمل کے ساتھ سب کی تقاریر سنتے اور آخر میں بہت ہی نپا تلا فیصلہ کرتے جو سب کی متفق رائے کے مطابق ہوتا وہ اسی وقت قلم بند کر لیا جاتا۔ امام صاحبؒ کی درس گاہ ایک قانونی مدرسہ تھا جس کے طلبا کثرت سے ملکی عہدوں پر فائز ہوئے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بڑی تعداد میں مسائل مدون کیے۔ ان کی تعداد تقریباً بارہ لاکھ نوے ہزار کے لگ بھگ ہے' ان کی زندگی میں ہی فقہ کے تمام ابواب مرتب ہو گئے تھے۔ یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے۔ اب فقہ کو سمجھ لیا جائے کہ فقہ کیا ہے؟ اس کی فنی ہیت و حیثیت کیا ہے؟

آفرینش سے انسان اپنی فطرت میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا' لیکن معاشرہ افراد کے مل جل کر رہنے سے تشکیل پاتا ہے۔ جس سے معاشرتی زندگی جنم لیتی ہے۔ انسان کی

فطرت میں بھی اللہ تعالیٰ نے مل جل کر رہنا مقدر کیا ہے' اس لیے اجتماعی زندگی ناگزیر ہے اور اجتماعی زندگی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ محبت کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی جنم لیتا ہے اور ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے شرائع معاشرہ انسانی معرض وجود میں آئے تاکہ افراد کے باہمی اختلافات ومخاصمات کا فیصلہ ہو سکے۔ اجتماعی زندگی میں باہمی معاملات لازمی ہو جاتے ہیں۔ جن سے لوگوں کے درمیان مختلف قسم کے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان تعلقات میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں' ان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے ایسے قوانین کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے جن کے ذریعے ہر کسی کے حقوق کا تعین ہو سکے اور باہمی اختلاف ومخالفت ومخاصمت کی روک تھام ہو سکے۔ انسان چونکہ معاشرتی طبع رکھتا ہے' وہ دیگر حیوانات کی مانند تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا' وہ عمرانی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون اور شراکت کے لیے بھی مجبور ہوتا ہے۔ اور ہر انسان اپنے لیے سازگار ماحول چاہتا ہے۔ اور اپنے حریف کے مقابلے میں غیظ وغضب کا اظہار کرتا ہے' اس لیے انسانی معاشرے میں وابستگی اور نظم وضبط رکھنے کے لیے عدل وانصاف کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین کی ضرورت پڑی۔

انسان اپنی زندگی کی تمام ضروریات تنہا اپنے آپ مہیا نہیں کر سکتا۔ نوع انسانی کی بقا اور زندگی کے لیے غذا اور دیگر ضروریات زندگی کے لیے معاشرے کے تعاون باہمی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ مل جل کر ہی زندگی کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں اور اسی میل جول میں کوئی ایک کسی دوسرے کے ساتھ ظلم وزیادتی بھی کر گزرتا ہے' جس سے مخاصمت ومخالفت جنم لیتی ہے اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے' پھر ضرورت اس بات کی پیدا ہوتی ہے کہ کوئی ایسا بااختیار حاکم ہو جو ان دونوں کے درمیان عدل وانصاف کر سکے' ورنہ تو انسان کی بقا ناممکن ہو جائے۔

ابتدائی دور میں چونکہ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی بالکل سادہ تھی ان کی عادات رسم ورواج سب کے سب بہت سادہ وآسان تھے' اس زمانے میں قوانین کا نفاذ قوم قبیلے کی رائے عامہ اور سردار قوم پر موقوف ہوا کرتا تھا' پھر انسان نے ترقی کی اور معاشرے کے حالات بدلے اور انسان میں مختلف قسم کے تعلقات وروابط پیدا ہوئے اور ان میں پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں پھر ان دشواریوں سے نمٹنے اور حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے قوانین وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو قوانین عادات' رسوم ورواج سے الگ ہو کر قبیلے کے سردار کی جگہ حکومت کے پاس چلے گئے اور حکومت اپنی طاقت کے ذریعے قوانین کو نافذ کر کے عدل وانصاف مہیا کرنے لگی۔

اسلام میں لفظ قانون شریعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شرائع اسلام' قوانین اسلام کے معنوں میں آتا ہے۔ اس سے علم اصول اور علم فقہ کی تشکیل ہوئی۔ علمِ اصول اور حکم شرعی یہ ایسا علم ہے جس میں دلائل شرع سے استنباطِ احکام (یعنی ایک حکم سے دوسرا حکم نکلنا یا بات سے بات نکلنا) کے طریقوں پر بحث ہوتی ہے' اس لیے اس علم کا موضوع بھی یہی احکام ودلائل ہیں۔

اسلامی قانون سازی کے اصول اور ماخذ بھی دلائل شرع کہلاتے ہیں اور ان میں چار پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ (۱) قرآن کریم (۲) سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع امت (۴) قیاس۔

حکم شرع شارع (اللہ تبارک وتعالیٰ) کا وہ حکم ہے جس میں شرعی نقطہ نگاہ سے کوئی مصلحت ہو۔ دوسرے لفظوں میں علمائے اصول کے نزدیک حکم شرع وہ حکم ہے جو شارع یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے مکلف بندوں کو دیا ہو' خواہ اس حکم میں کسی بات کا مطالبہ ہو یا کسی امر کا اختیار دیا ہو یا آداب انسانی کے طور طریقوں کا حکم دیا ہو۔ ابو معید المخادمیؒ کی کتاب ''مجامع

الحقائق'' میں کہا گیا ہے کہ ''حکم کا نصب العین اجتماعی ہوتا ہے نہ کہ انفرادی'' یعنی وہ قانون کی طرح عام ہوتا ہے جو کسی خاص فرد یا خاص حالت کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔

حکم شرعی کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے' حاکم' محکوم فیہ' محکوم علیہ' حاکم بہ معنی شارع ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے' کیونکہ شرع اسلامی میں سب سے پہلا حکم صادر کرنے والا وہی ہے اور محکوم فیہ وہ عمل ہے جس کے لیے وہ شرعی حکم دیا گیا ہو اور محکوم علیہ انسان ہے جو حکم شرعی کا مکلف ہے۔ مگر فرضیت احکام کے لیے انسان کا عاقل بالغ اور ذی ہوش ہونا لازم ہے۔

حکم شرعی کی دو اقسام ہیں' ایک تکلیفی' دوسری وضعی۔ حکم تکلیفی وہ ہے جو براہ راست ان اعمال سے متعلق ہے جن کی تعمیل انسان سے مطلوب ہے' جس کا اسے اختیار دیا گیا ہے۔ اس طرح سے انسانی اعمال پانچ اقسام کے ہوں گے' پہلا واجب' دوسرا مندوب' تیسرا مباح چوتھا مکروہ پانچواں حرام۔ یہ سب حکم تکلیفی ہیں۔ واجب وہ عمل ہے جس کا کرنا ازروئے شرع ضروری ہو اور ترک کرنا قابل مذمت ہو۔

حرام۔ وہ عمل ہے جس کا ترک کرنا ازروئے شرع ضروری ہو اور کرنا مذموم ہو۔

مندوب یا مستحب۔ وہ عمل ہے جس کا کرنا ازروئے شرع مطلوب ہو اور نہ کرنا مذموم نہ ہو۔

مکروہ۔ وہ عمل ہے جس کا چھوڑنا روئے شرع مطلوب ہو اور کرنا گناہ نہ ہو۔

مباح۔ جسے کرنے یا نہ کرنے کا انسان کو اختیار ہو' نہ اس کا کوئی ثواب ہوگا اور نہ کرنے کا کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا۔ (الاحکام فی اصول الاحکام جلد اول۔ آمدی)

حکم وضعی وہ حکم ہے جو بذات خود کوئی حکم نہ ہو' بلکہ کسی سبب یا شرط یا کسی امر مانع کی وجہ سے بنایا گیا ہو جو انسانی عمل کا نتیجہ ہو یا کسی عمل کا درست یا غلط نتیجہ بہ حالت مجبوری حرام

چیز کے استعمال کرنے کی اجازت ہونا۔

مثلاً قتل قصاص کا سبب ہے' اس مثال میں قصاص حکم وضعی ہے جو قتل کی وجہ سے ہے' کیونکہ قتل کرنے پر قصاص واجب ہوگا۔ اسی طرح فروخت شدہ چیز پر خریدار کا قبضہ سودے کی تکمیل کی شرط ہے' اس لیے یہاں تکمیل بیع ایک حکم وضعی ہوا جو مشروط ہے قبضے سے' کیونکہ بیع بغیر قبضے کے مکمل نہیں ہوتی۔

فقہ اسلامی کے چار ماخذ بیان کئے جاتے ہیں' ان کی تفصیل اس طرح کی گئی ہے۔

(۱)۔ کتاب اللہ' قرآن حکیم۔

(۲)۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳)۔ اجماع۔

(۴)۔ قیاس۔

بعض فقہا قیاس کو ماخذِ فقہ اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔ ایسے ہی مسالک اربعہ میں قیاس کی صورتیں' شرائط' اور اصول الگ الگ ہیں۔ بعض اہل علم فقہ کے لیے دس اصول بیان کرتے ہیں۔

(۱)۔ قرآن مجید۔

(۲)۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) خلفائے راشدین کا تعامل۔

(۴) اجماع۔

(۵)۔ قیاس۔

(۶)۔ مسلمان حکمرانوں کی طرف سے جاری کردہ ایسے احکام جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہوں۔

(۷)۔ ثالثوں کے وہ فیصلے جن سے قرآن وسنت اور اجماع کی نفی نہ ہوتی ہو۔

(۸)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم' خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین' صحابہ کرام رضی اللہ عنہ مسلمان خلفا کی طرف سے اپنے عمال وسفرا کے لیے جاری کردہ ہدایات (بعد کے دور کے مسلمان خلفا کی طرف سے جاری کردہ ہدایات جس میں فقہا کا مشورہ بھی شامل ہو۔)

(۹)۔ بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قانون سازی جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو۔

(۱۰)۔ ایسے عرف' عادات' رسوم ورواج جو قرآن وسنت کے احکام کے خلاف نہ ہو۔

شوافع (شافعی) قرآن وسنت' اجماع' قیاس اور استحباب' فقہ کے لیے ان پانچ ماخذوں کو مانتے ہیں۔ جبکہ احناف مذکورہ پانچ میں دو ماخذوں استحسان (یعنی بہتر معلومات) اور عرف (یعنی پہچان) کا اضافہ کرتے ہیں۔

حنابلہ مذکورہ پانچ میں دو ماخذ مصالح اور سدذ رائع کا اضافہ کرتے ہیں۔

مالکیہ۔ مذکورہ بالا تمام ماخذوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

فقہ اسلامی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر موجودہ وقت تک کے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور۔ عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

دوسرا دور۔ عہد خلفائے راشدین واکابر صحابہ رضوان اللہ اجمعین کا۔

تیسرا دور۔ عہد صغائر صحابہ رضی اللہ عنہ اور تابعین کا۔

چوتھا دور۔ عہد خلافت بنو عباس کا۔

پانچواں دور۔ تقلید خالص اور انحطاط کا دور۔

چھٹا دور۔ تقلید محض کا دور۔

ساتواں دور۔ موجودہ دور۔

فقہ اسلامی کا پہلا دور عہد نبوت صلی اللہ علیہ وسلم

فقہ اسلامی کا پہلا دور بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتا ہے۔ (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری مطابق ۸ جون ۶۳۲ سن عیسوی بروز دوشنبہ پر ہوا۔ اُس وقت مکمل ہوا۔

ایام جاہلیت میں یعنی قبل از اسلام لوگ ایسی سادہ زندگی بسر کرتے تھے جو فطرت سے قریب تر تھی۔ ان کا نظام زندگی رسوم ورواج پر مبنی تھا' ان کا معاشرہ متفرق قبائل کا مجموعہ ہوتا تھا اس میں کسی مرکزی حکومت کا تصور نہیں تھا' ان کی اجتماعی زندگی قبائلی عصبیت پر تھی۔ ہر فرد اپنے قبیلے سے وابستہ ہوتا تھا چاہے قرابت دار سے یا باہمی عہدو پیمان کے ذریعے' اس لیے وہ اپنے قبیلے کی جانب داری کیا کرتا تھا۔ بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں اپنے قبیلے کی حمایت ہر حال میں کرتا تھا۔ اس دور میں قبائل میں جنگ وجدل عام تھی' مرد وعورتوں کو قید کر کے لونڈی وغلام بنانے کا رواج بھی عام تھا خاندان کا نظام منتشر اور پراگندہ ہوتا تھا۔ عورتوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ فقر وفاقہ کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ طلاق عام تھی۔ بلا کسی وجہ کے بھی طلاق دے دی جاتی تھی۔ عورت اور بچے حق وراثت سے محروم رہتے تھے۔ (تفسیر فخر الدین رازیؒ اور تفسیر زمخشریؒ)

اس دورِ مبارک میں قرآن مجید فقہ اسلامی کا ماخذ اور اصل سرچشمہ تھا' اس کے ساتھ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عملِ مبارک (سنت) بھی تشریح کی بنیاد بنا' کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے یا کرتے تھے' اس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی تھی۔ بعض امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی عرف کے مطابق فیصلے کیے جن کی تائید وتصدیق وحی الٰہی کے ذریعے ہوگئی۔

دوسرا دور۔ عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

یعنی بڑے اور اہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین

فقہ اسلامی کا دوسرا دور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم (یعنی بڑے اور اہم صحابہ کرام) کا ہے جو ۱۱ ہجری سے لے کر ۴۰ ہجری تک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے بڑے بڑے اہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے تھے کسی مسئلے پر قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ کرلیا کرتے تھے اور اس کے بارے میں باہم مشورے بھی کیا کرتے تھے اور جب قرآن وسنت سے کسی چیز کے لیے واضح حکم نہ ملتا تو اجماع وقیاس سے کام لیتے تھے۔ اسی دور میں قانون سازی کے لیے قرآن وسنت کے ساتھ اجماع وقیاس بطور دلائل شرعیہ کے پیدا ہوئے۔ فتویٰ دینے اور مقدمات کے فیصلے میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور ان میں خصوصی طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہم حصہ لیا۔ کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مملکت اسلامیہ میں فتوحات کے ذریعے کافی توسیع ہوئی تھی۔ انہوں نے شریعت اسلامی کی حقیقی روح کو سمجھا اور زمانے کی ضروریات کے مطابق سلطنت اور اس سے متعلقہ اداروں کی تنظیم کی۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی تفصیل کے لیے الگ کتب موجود ہیں۔)

عہد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں پیش آمدہ مسائل کے بارے میں فیصلے دیئے جاتے تھے تمام اہم اور بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خصوصی طور پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے متعلق بڑی ہی احتیاط کیا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں قرآن وسنت کے

احکام ومنشا تک پہنچنے کے لیے آپس میں اختلاف بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کئی مواقع پر دوسرے بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اختلاف کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مملکت اسلامی کی بنیاد رکھنے اور شریعت اسلامی کی حقیقی روح کو سمجھنے اور قوت واستقلال' عدل وانصاف کے ساتھ نافذ کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ کا بڑا اہم کردار ہے۔ اسی دور مبارک میں قرآن کریم ایک مصحف میں جمع کیا گیا اور ایک قرآت کے مطابق جمع کیا گیا۔ اسلامی تشریح کا یہ دور دوسری صدی ہجری تک چلا۔ خلافت راشدہ کے آخری دور میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت' حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ کے مابین جنگ صفین اور جنگ جمل جیسے اہم نزاعی اور اختلافی امور سے امت مسلمہ تین گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔

(۱)۔ شیعہ۔ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔

(۲) عام مسلمان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہو گئے تھے۔

(۳)۔ خوارج جو انتہا پسند گروہ تھا وہ حضرت عثمان' حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ کے خلاف تھے اور خلافت کو جمہور کا حق سمجھتے تھے۔

اس دور کے فقہاء' صحابہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خلفائے راشدین اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ' ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ' معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ' زبیر بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔ فقہائے کبار کے مختلف مسالک بعد میں جغرافیائی ناموں

سے مشہور ہوئے کیونکہ فقہا صحابہ مختلف مقامات پر مقیم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اصحابِ مدینہ اصحابِ عراق اور اصحابِ شام کا فرق اسی دور سے شروع ہوا۔

تیسرا دور۔ عہد صغارِ صحابہ اور تابعین

صغار صحابہ کرام اور تابعین کا دور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت ۴۱ ہجری سے شروع ہوتا ہے اور بنوامیہ کے زوال تک رہتا ہے۔ اس دور میں داخلی سیاسی کشمکش زوروں پر تھی۔ شیعہ اور خوارج کے گروہ مضبوط ہو گئے اور دوسری طرف مملکت اسلامیہ کا دائرہ چین کی سرحدوں سے لے کر اندلس تک پھیل گیا۔ ان تمام حالات و معاملات کا فقہ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتوحات کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں پھیلتے چلے گئے اور غیر اقوام کی شمولیت سے احادیث کی روایت میں جو کثرت پیدا ہوئی اس کی وجہ سے کافی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس زمانے میں فقہی نقطہ نگاہ سے مسلمان تین گروہوں میں بٹ گئے۔ اہلِ حدیث جو اہلِ حجاز تھے۔ اہلِ الرائے جو اہل عراق تھے اور ظاہریہ جو ظاہر حدیث کو لیتے تھے اس گروہ کے امام داؤد ظاہری تھے۔ اسی زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث کی حفاظت کا کام شروع کرایا۔ اس کام میں ابن شہاب زہریؒ نے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا۔

اکابر صحابہ کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور تابعین میں شریح بن حارثؒ ابراہیم بن یزید نخعیؒ طاوس بن کیسان حمدیؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں فتاویٰ دیا کرتے تھے۔

چوتھا دور۔ عہد خلافتِ بنو عباس

فقہ کا چوتھا دور دوسری صدی ہجری بمطابق آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے وسط تک کا دور ہے۔ فقہ وحدیث کی تدوین کا دور ہے۔ اس دور سے ہی حدیث وفقہ کے مشہور آئمہ کرام کی قیادت کو جمہور نے تسلیم کیا۔ اس عہد خلافت کا آغاز ان لوگوں کی کامیابی کا دور تھا جو ایک طویل عرصے سے خلافت کو بنوامیہ سے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور میں اہل بیت کے ماننے والوں کے درمیان بھی اختلاف واضح ہو کر سامنے آئے اور امامت اور خلافت کے سلسلے میں آئمہ اہلِ بیت میں کافی تفریق پیدا ہوگئی اور ان کے دو مذہب مشہور ہوگئے۔ شیعہ زیدیہ اور شیعہ امامیہ۔ شیعہ فقہی مسائل میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی فقہ جعفریہ سے استفادہ کرتے تھے۔ اس دور میں کئی فقہی مذاہب پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سے چار تو اپنے مذاہب کے بانیوں کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ حنفی مسالک کے بانی امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ، مالکی مسلک کے بانی امام مالک بن انسؒ، شافعی مسلک کے بانی امام شافعیؒ اور حنبلی مسلک کے بانی امام احمد بن حنبلؒ۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے مسالک وجود میں آئے جو وقت کے ساتھ ساتھ از خود ختم ہوتے رہے۔

اسی دور میں احادیث نبویؐ جمع ہوئیں اور ان کے مجموعے مرتب ہوئے جن میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد، بیہقی، نسائی کے مجموعے احادیث مشہور ہیں۔ اس زمانے میں قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں اور فقہ کے اصول اور فروع پر بہت کام ہوا اور بہت سی کتب لکھی گئیں۔ اور اس طرح کئی نئے علوم وجود میں آئے۔ اہلِ سنت میں فقہا کے دو

بڑے گروہ بن گئے ایک اہلِ الرائے جماعت جو عراق میں امام ابوحنیفہؒ کی قیادت میں قائم ہوا اور دوسری جماعت اہلِ حدیث جو حجاز میں امام مالک بن انسؒ کی سرکردگی میں قائم ہوئی۔

پانچواں دور۔ تقلیدِ خالص اور انحطاط کا دور

اس دور کا آغاز چوتھی صدی ہجری کی ابتدا سے ہوا اور انتہا سلطنتِ عباسیہ کے زوال پر ہوئی۔ سلطنت عباسیہ کے آواخر میں علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ صرف خاص خاص مسالک کی پابندی پر اکتفا کرلیا گیا ان کی ہی تائید کے لیے مناظرہ وجدال میں شدت پیدا ہوگئی جس کے باعث ہر طرف جمود چھا گیا اور تقلید پھیل گئی۔ فقہی اجتہاد رک گیا۔ اس دور کو تقلید خالص کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں مذہبی تعصبات کو فروغ ملا۔ شیعہ مذہب کی ایک نئی شاخ اسماعیلیہ سامنے آئی جس کے باعث شیعہ مذہب تین گروہوں میں بٹ گیا۔ زیدیہ۔ امامیہ اثنا عشری اور اسماعیلیہ۔

چھٹا دور۔ تقلید محض کا دور

بغداد میں مسلمانوں کی ہلاکو خان کے ہاتھوں شکست کے بعد امت مسلمہ میں افراتفری پیدا ہوجانے سے تمام فقہی کام رک گیا اور امت مسلمہ کی اکثریت تقلید محض پر قائم ہوکے رہ گئی جس سے مسلمانوں کو شدید شرعی نقصان سے دوچار ہونا پڑا اور مذہب میں بدعات جنم لینے لگیں۔ مسلمان دین سے دوری اور گمراہی کا شکار ہونے لگے۔

ساتواں موجودہ دور

بے جا اور غلط تقلید کے باعث امت مسلمہ میں بہت سی خرافات اور بدعات کثرت سے پھیل گئیں۔ جن کی بنیاد وہم اور جہالت پر تھی۔ لوگ شریعت کی اصل روح کو نظر انداز کر کے بعض نام نہاد محققین کے اجتہاد کے پابند ہو گئے۔ اس دوران تقی الدین ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ الجوزیہ جیسے مجددین اس اعلان کے ساتھ میدانِ عمل میں اترے کہ تقلید کو ترک کیا جائے اور مذہب فقہ میں وحدت پیدا کی جائے اور بدعات وخرافات کو ترک کیا جائے۔ یہ دونوں حضرات آٹھویں صدی ہجری اور چودھویں صدی عیسوی کے حنبلی فقہا سے متعلق تھے۔ فقہا قدیم نے اسلامی فقہ کی تدوین جن حالات میں کی تھی موجودہ دور کے مسائل ان سے مختلف ہیں اس لیے ضرورت ہوئی کہ اسلامی فقہ کی تشکیل نو کی جائے اور اسلامی فقہ کی تشکیل نو کے لیے قرآن وسنت سے ہی رہنما اصول لیے جائیں اور فقہ قدیم کے فیصلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید مسائل کا حل نکالا جائے۔ برصغیر پاک وہند افغانستان ترکی کے علاقوں میں زیادہ تر مسلمان فقہ حنفی پر عمل پیرا ہیں۔

فقہ دراصل ایسا علم ہے جو اسلامی دینی مسائل کو اس طرح حل کرتا ہے کہ وہ قرآن وسنت سے کہیں ٹکراتے نہیں بلکہ قرآن وسنت کی ہی روشنی میں ایسے مسائل کا حل نکالا جاتا ہے جن کے بارے میں قرآن وسنت یا تو خاموش ہیں یا ان کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تب ایسے مسائل کے حل کے لیے قرآن وسنت کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے قیاس قوی سے کام لیتے ہوئے ان کا حل تلاش کرنے کی ابتدا ہوئی۔ فقہی مسائل کو بہت آسانی اور سہولت کے ساتھ مدلل طریقوں سے جس طرح سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے سمجھا اور سمجھایا' دوسرے آئمہ

کے ہاں اتنی وضاحت وصراحت نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی آسان ہونے کی وجہ سے ہی عوام الناس میں جلدی مقبول عام ہو گیا۔ اور کثرت سے اہلِ ایمان اس کی تقلید کر رہے ہیں۔

فقہ حنفی کو دوسری فقہوں سے جو امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اس کی وسعت اور آزادی کے ساتھ ساتھ اس کے قواعد نہایت صاف اور آسان ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے تمام قیاس ورائے قرآن حکیم وسنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی ہی میں کیے۔ ان کے تمام فیصلے احکامِ الٰہی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہیں۔ انہوں نے احادیث کی قسموں میں جو دقیق فرق ہے اسے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ قانون فقہ دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں اور امور آخرت سے متعلق ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور تشریعی احکام کہے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ احکام جو دنیاوی امور سے متعلق ہیں ان میں تین قسم کے معاملات ہیں۔ (۲)۔ عقوبات یعنی تعزیرات احکامِ نکاح اور دیگر معاملات جو تمدن ومعاشرے کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر شریعت میں تو ہے لیکن تشریحی طور پر نہیں ہے۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہہ کی حیثیت شارح ومفسر کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے زبان پر عبور، مہارت، واقفیت، نصوص قوت استنباط، توفیق متعارضات اور ترجیح دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری قسم فقہ کے لیے ضروری ہے کہ فقیہہ قوانین اسلامی وشریعت اسلامی سے پوری طرح واقف ہو اس لحاظ سے اس کی قابلیت اس رتبے کی ہونی چاہئے جیسی دنیا کے مشہور قانون دانوں کی ہوتی ہے۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سی شخصیات ایسی گزری ہیں جو قرآن وحدیث کے بہترین مفسر اور شارح تھے۔ لیکن مقننانہ یعنی قانون دانی کی قابلیت نہیں رکھتے تھے ایسے ہی بہت سی شخصیات ایسی بھی گزری ہیں جن میں مقننانہ قابلیت تو بہت تھی لیکن وہ نصوص شرعی کے مفسر نہیں تھے لیکن

یہ دونوں صلاحیتیں اور قابلیتیں امام اعظم ابوحنیفہؒ میں بدرجہ اتم خداداد موجود تھیں جو اور کسی مجتہد امام میں اس طرح جمع نہیں ہوئیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ اسلامی میں جو سب سے اہم اور بڑا کارنامہ سرانجام دیا وہ ہے تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کا جو سلسلہ روایت سے منضبط کیا گیا ان میں بہت سے ایسے امور بھی تھے جن کا منصب رسالت مآب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اصطلاح کے طور پر ان پر بھی حدیث کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ حجتہ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ کتب حدیث میں ان کی تدوین کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایسی احادیث جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرما رہا ہے۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ
(ترجمہ) ''پیغمبر جو چیز تمہیں دے اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔''
(الحشر 7)

(۲)۔ جو تبلیغ ورسالت کے مطابق نہیں ہیں چنانچہ ان کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ''میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اس کے پابند ہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں۔''
اس دوسری قسم میں وہ احادیث آتی ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے متعلق ارشاد فرمائیں۔ اور اس قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عادتاً صادر ہوئے نہ کہ عبادتاً اور اتفاقاً۔

شاہ ولی اللہؒ نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا ہے یہ وہی نقطہ ہے جس

کی طرف سب سے پہلے امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا ذہن رسا منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل مثلاً غسل جماع، خروج النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ ہیں جو حدیثیں وارد ہیں ان کو امام ابوحنیفہؒ نے دوسری قسم میں داخل کیا۔ جبکہ امام شافعیؒ اور دیگر آئمہ ان احادیث کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نقطہ شناس ہوسکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے خلفائے راشدین اور صحابہ کبار کے طرز عمل کو ہی دلیل کی راہ بنایا ہے۔ فقہ کی پہلی قسم یعنی تبلیغ ورسالت سے متعلق احادیث کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ نے جو بڑا کام کیا وہ قواعد کا استنباط تھا جس کی وجہ سے ایک مستقل علم بن گیا۔ امام ابوحنیفہؒ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور تعجب انگیز ہے وہ ان کے قواعد کی تجوید اور انضباط ہے اور یہ سب کچھ انہوں نے ایسے زمانے مین کیا جب علوم اسلامی نہایت ہی ابتدائی حالت میں تھے۔ یہاں تک کہ نقل وکتابت یعنی تحریر کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اس وقت ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنا یہ امام ابوحنیفہؒ کا ہی کارنامہ ہے۔ امام صاحبؒ ہی اس کے حقیقی موجد ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ کہ استنباط مسائل اور احکام کی توضیح تابعین بلکہ صحابہ کرام کے زمانے میں شروع ہوچکی تھی لیکن اس کی کوئی علمی صورت متعین نہیں ہوئی تھی گو کہ وقت کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ نہایت ہی وسیع فن بن گیا۔ سیکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہوئے جن کا امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ لیکن فن فقہ کے اہم مسائل جن پر اس فن کی بنیاد قائم ہے امام صاحبؒ کے زمانے میں ہی منضبط ہوچکے تھے۔ اصول اربعہ کی توضیح، حدیث کے مراتب اور ان کے احکام، جرح وتعدیل کے اصول اجماع کے حدود وضوابط، قیاس کے احکام شرائط، احکام کی مختلف اقسام کی عمومی اور خصوصی تحریر رفع تعارض کے قواعد فہم مراد کے طریق یہ مسائل اصول فقہ کے ارکان ہیں ان تمام مسائل کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہ

ؒ نے ضروری اصول منضبط کر دیئے تھے۔اس باب میں حضرت امام صاحبؒ نے جو کام سرانجام دیا ہے وہ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی بے نظیر و اہم ہے۔

فقہ کے پہلے حصے میں ایسی احادیث جن کا تعلق تبلیغ و رسالت سے ہے اور قرآن حکیم کی آیات سے ہے جب کہ فقہ کے دوسرے حصے کا تعلق ایسے تمام معاملات سے جو تبلیغ و رسالتؐ سے متعلق نہیں ہیں لیکن معاشرہ اور نظام زندگی میں درپیش مسائل اور واقعات سے وابستہ ہیں اس لیے فقہ کا دوسرا حصہ صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے یہ پہلے حصے کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہی وہ خاص حصہ ہے جس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ تمام دیگر مجتہدین سے بہت نمایاں اور ممتاز ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں اگر کوئی شخص اسلامی قوانین کو واضح کرنے والا گزرا ہے تو وہ صرف امام ابوحنیفہؒ ہی ہیں۔امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے اس دوسرے حصے کی اس طرح تدوین کی ہے کہ اس کے ضبط و ربط سے اس کی جزئیات تک پر توجہ دی ہے وہ اپنے زمانے کا نہایت ہی وسیع قانون تھا۔اگر چہ اس کی تعبیر فقہ سے کی جاتی ہے لیکن درحقیقت اس میں بہت سے قوانین شامل ہیں۔چنانچہ آج کی دنیا میں انہیں الگ الگ ابواب کے مسائل میں ترتیب دیا گیا ہے۔وہ الگ الگ قوانین کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔مثلاً قوانین معاہدہ، قانون بیع، قانون لگان و مال گزاری، تعزیرات، ضابطہ فوجداری وغیرہ۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اپنے ہم عصروں میں اس لیے بھی ممتاز و نمایاں تھے کہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔اور معاشرے و تمدن کی ضروریات کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔اس لیے وہ مرجعیت و فصلِ قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات ان کی نگاہ سے گزر چکے تھے۔اس لیے حنفی فقہ دیگر فقہوں کے مقابلے میں مقدم اور قابل قدر مانا گیا کہ اس میں مسائل کے اسرار اور مصالح پر توجہ نہیں دی گئی۔احکامِ شرعیہ کے

متعلق اسلام میں شروع سے ہی دو سوچ وفکر پائے جاتے ہیں۔ایک گروہ کی رائے میں احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی بھید و مصلحت نہیں ہے جیسے شر یا فسق وفجور اس لیے برے اور ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے۔اور زکوۃ وخیرات اس لیے مستحق اور پسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان کی تاکید کی ہے اور پسند کیا ہے۔جبکہ دوسرے گروہ کے مطابق شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔البتہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھتے لیکن وہ بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتے۔نماز روزے اور جہاد کی مصلحت کے بارے میں قرآنِ حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ خود تشریح فرما رہا ہے اسی طرح اور احکام کے بارے میں قرآن وحدیث میں جگہ جگہ صراحت واشارے موجود ہیں اور ان کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا طریقہ اور ان کے مسائل فقہ میں عموماً اس کا اثر نظر آتا ہے۔فقہ حنفی جس قدر اصولی اور عقلی دلائل کے مطابق ہے کوئی اور فقہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔حضرت امام شافعیؒ اس بات سے متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ فقہ عقل تسلیم کرتی ہے۔اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں امام ابوحنیفہؒ کا اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔کیونکہ امام صاحبؒ کے سوا دیگر آئمہ فقہ جنہوں نے فقہ کی تدوین اور تالیف کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہی ہوئی تھی۔جبکہ امام ابوحنیفہؒ کی تحصیلِ علم علمِ کلام سے ہوئی تھی۔جس کی مہارت نے ان کی قوت فکر اور وسعتِ نظر کو نہایت قوی و مستحکم کر دیا تھا۔کیونکہ جن لوگوں سے امام صاحبؒ کے معرکے ومناظرے ہوا کرتے تھے وہ عقلی اصولوں کے پابند تھے اس کے بغیر وہ کسی بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔اس لیے امام صاحب کو بھی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انہی اصولوں سے کام لینا پڑتا اور متنازعہ فیہ مسائل میں مصالح اور اسرار کی خصوصیات پیدا کرنا پڑتیں اسی غور وفکر، تحقیق ومشق ومہارت نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ

شریعت کا ہر مسئلہ اصول و عقل کے مطابق ہے علم کلام کے بعد جب امام ابوحنیفہؒ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل کے حل کے لیے بھی وہی طریقہ وہی جستجو برقرار رہی' یہی وجہ ہے کہ تمام دیگر فقہوں کے مسائل کے مقابلے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف اور طریقہ فقہ میں فرق صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عباداتِ الٰہی میں بھی جس میں ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ امام صاحب کے مسائل عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔ اور تمام دیگر فقہوں کی نسبت آسان اور تیزی سے عمل درآمد ہونے والے ہیں جو قرآنی احکام کے مطابق بھی ہیں کیونکہ قرآنِ حکیم میں متعدد جگہ فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔ یہی قول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے کہ "میں نرم اور آسان شریعت لے کر آیا ہوں۔" یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ اسلام تمام مذاہب سے آسان اور قابلِ عمل مذہب ہے۔ نہ اس میں رہبانیت ہے نہ عبادت میں سختی ہے' تمام عبادت اور احکام الٰہی آسان موثر اور فوری قابل عمل ہیں۔ یہی عمل امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ میں اپنایا ہے جس کے باعث فقہ حنفیہ مقبولِ عام ہوا۔

اس سے قبل کہ فقہ کی تفصیل کی طرف جائیں ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جہاں جہاں اور جیسے جیسے تحصیلِ علم کی اور جو ان کے فقہی مسلک کی بنیاد بنے اور اس کی جھلک ان کے فقہی احکام میں نظر آتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے شیوخ مختلف مشرب اور مسلک کے تھے۔ وہ خصوصیت کے ساتھ کسی ایک گروہ یا طبقہ اہلِ رائے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بعض ان میں فقہائے حدیث تھے۔ اور بعض مفسر قرآن تھے۔ امام صاحبؒ نے ہر اس جگہ اور ہر اس شخص سے علم حاصل کیا جس سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فتاویٰ کا علم حاصل ہوسکتا تھا۔ امام صاحبؒ نے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ حاصل کیے وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فتاویٰ کے تتبع اور جستجو میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ امام صاحبؒ نے جن صحابہ کرام

کے فتاویٰ حاصل کیئے وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم وہ تھے جنہیں کتابِ الٰہی اور سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا عبور حاصل تھا اور اجتہاد وفکر میں بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔

امام صاحب کے فقہ پر اہلِ رائے کا گمان ہے کہ وہ شیعہ شیوخ سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لیے ان کے فتاویٰ میں شیعہ مسلک کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں مختصراً شیعہ فقہ یعنی فقہ جعفریہ کے بارے میں کچھ معلومات جمع کردی جائیں تاکہ فقہ حنفی کو سمجھنے میں آسانی رہے اور اس کا تمام دیگر مسالک سے تقابلی جائزے میں آسانی رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مشاورت سے مسند خلافت سونپی گئی تھی لیکن ایک جماعت (محبان علی) ایسی بھی تھی جو اس فیصلے کی مخالف تھی وہ تینوں خلفائے راشد کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کا زیادہ حق دار مانتے تھے کہ وہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اور چچازاد بھائی بھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کے شوہر' مسنوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ان کے قول کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کی وصیت فرمائی تھی چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کرنے کے باعث بعد میں یہ لوگ شیعان علی کہلائے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ خلفائے راشدین' خلفائے بنی امیہ' خلفائے بنی عباس سے اہلِ بیت کی خلافت کا حق واپس انہیں دلایا جائے۔ شیعہ سنی مسالک کے اختلاف میں جیسے مسئلہ امامت' مسئلہ اجتہاد' شرعی دلائل' مذہبی اصول وفروع' عبادات اور دیگر معاملات مسئلہ امامت میں ان کے یہاں بھی فرقے ہیں جن کی تفصیل گزشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے۔

نظریاتی اختلاف کی ابتدا پہلی بار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور خلافت میں

ہوئی۔ یہی شیعہ مذہب کا نقطۂ آغاز تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور جانشینی کا مسئلہ بظاہر بہت سادہ اور خوش نما تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ تعلیمات کے خلاف تھا کیونکہ اسلام نے نسلی امتیاز اور خاندانی غرور کو ختم کر دیا تھا اور اسلام میں عزت، شرافت اور سیادت و بزرگی کا دارومدار تقویٰ پر رکھا تھا۔

کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسرِ منبر یہ سوال کیا گیا کہ آپ لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ کیوں بنایا؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ دین کے کاموں میں سب سے اہم نماز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ ہی کو ہمارا ''امام نماز'' بنایا تھا جبکہ میں وہاں موجود تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میری موجودگی کا علم بھی تھا مگر اُس کام کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یاد نہیں فرمایا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخصیت کو ہمارے دین کی امامت کے لئے منتخب فرمایا تھا ہم نے دنیا کی امامت وقیادت کے لئے اُسے ہی چُن لیا۔ (اختلاف امت اور صراط مستقیم از حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی)

فقہ جعفریہ:۔ شیعہ فرقے کا فقہ ہے شیعہ فرقہ سب سے قدیم فرقہ ہے اس کی بنیاد چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق کے مقرر کردہ اصول پر رکھی گئی ہے۔ یہ مذہب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں سیاسی رنگ میں نمودار ہوا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں انہیں عروج حاصل ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب عوام سے ملتے جلتے تو ان کی سخاوت و دین داری اور علم دیکھ کر لوگ سراپہ نیاز وعقیدت بن جاتے تھے۔ شیعہ مذہب کے ماننے والوں نے حضرت علی رضی اللہ کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان سے اپنی وابستگی کر لی اور لوگوں میں ان کا چرچا کرنے لگے اور ان سے اپنی عقیدت اپنے تعلق

کا اقرار کرنے لگے۔ اور بہت سے لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیروکار ہو گئے' درحقیقت شروع ہی سے حامیانِ علی شیعہ کہلاتے تھے اور یہیں سے شیعہ فرقے نے نشوونما حاصل کی۔ مذہب شیعہ کا اصل اصول یہ ہے کہ امامت مصالح آئمہ میں سے نہیں ہوتی کہ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ دین کا اہم رکن ا۔ سلام کا ستون ہے اور نبی اس سے غفلت نہیں برت سکتا کہ اسے امت کو تفویض کر دے بلکہ اس پر لازم ہے کہ امت کے لیے ایک امام کا تعین کر دے اور یہ امام تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہو (مقدمہ ابن خلدون) امام کا تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور دنیا کبھی امام سے خالی نہیں رہتی وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بلافصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین مانتے ہیں کیونکہ امام ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی شناخت کراتا ہے۔

شیعہ مذاہب کی اساس و بنیاد عقیدہ امامت اور امام آخر الزماں (مہدی منتظر) کی غیبت صغریٰ اور غیبت کبریٰ کے زمانہ ولایت فقہ کے نظریے کی بنیاد پر قائم ہے جس طرح امت مسلمہ کے نزدیک نبی و رسول کا تقرر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے بالکل اسی طرح شیعہ مسلک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُن کا جانشین وخلیفہ یعنی امام بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مقرر و نامزد ہوتے ہیں۔ وہ نبی ہی کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت نبی اور رسول کی طرح امت پر فرض ہوتی ہے۔ امام کا درجہ تمام نبیوں سے بالاتر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہوتا ہے۔ امام ہی امت کے تمام دینی اور دنیوی معاملات وامور کا سربراہ وحاکم ہوتا ہے۔ ساری امت بلکہ ساری دنیا پر حکومت کرنا صرف اس کا ہی حق ہوتا ہے کیونکہ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے نامزد کیے ہوئے آئمہ معصومین کا حق ہے۔ جس طرح نبی پر ایمان لانا فرض اور اسے ذریعہ نجات ماننا شرط ہے اسی طرح ان اماموں کی امامت کو تسلیم کرنا اور ان کو اللہ کا مقرر کیا ہوا امام معصوم اور حاکم ماننا بھی نجات کی

شرط ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے دنیا کے خاتمہ تک یعنی قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارہ امام نامزد ہیں۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نامزد فرمایا ہے۔ پہلے امام حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ)(۲) حضرت امام حسن بن علی (۳) حضرت امام حسین بن علی (۴) امام علی بن حسین (۵) امام محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) امام موسیٰ کاظم (۸) امام رضا (۹) امام محمد تقی (۱۰) امام محمد نقی (۱۱) امام حسن عسکری (۱۲) امام حجت۔ یہ امام حسن عسکری کے صاحب زادے تھے جو چھوٹی عمر میں ہی معجزانہ طور پر سرمن رائی کے غار میں روپوش ہو گئے ہیں۔ قیامت تک ان کی ہی امامت اور حکومت کا زمانہ ہے۔ شیعہ عقیدے کے مطابق امام حجت کا نام لینا بھی حرام ہے۔ وہ غائب ہیں اور غار میں روپوش ہو گئے ہیں۔ جب وہ مناسب سمجھیں گے (قرب قیامت کے وقت) غار سے نکل آئیں گے جب ایسا وقت آئے گا تو وہ وقت ان کی غیبت کبریٰ کا کہلائے گا۔ یہ شیعہ فرقے کا بنیادی عقیدہ ہے۔ امام حجت کو آخری امام اور مہدی منتظر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اصول کافی میں کتاب الحجۃ امام جعفر صادق کا قول اس طرح آیا ہے کہ بندوں کے نزدیک ہونا اللہ اور اللہ کا راضی ہونا ان سے ایسی حالت میں جب وہ حجت اللہ کو غائب پائیں اور وہ ان پر ظاہر نہ ہوں اور ان کی جائے قیام کو نہ جانے اور اس کا علم رکھیں کہ حجت اللہ سے زمانہ خالی نہیں ہوتا اور نہ اس کا عہد جو بندوں سے ہے باطل ہوتا ہے۔ پس اُن کو چاہئے کہ ہر صبح و شام ظہور حجت علیہ السلام کی توقع رکھیں۔ حجت اللہ کا غائب ہونا علامت ہے کہ اللہ کا غضب ہے۔ ان کے دشمنوں پر امام کو ظاہر نہیں کیا۔ اللہ کو اس کا علم ہے۔ وجود حضرت حجت میں کوئی شک نہیں ہے اور جو شک کرے وہ بدترین لوگوں میں ہے (اصول کافی علامہ محمد یعقوب کلینی)

موجودہ دور میں امام خمینی جو امام غائب یا امام آخر الزمان کے نائب اور قائم مقام کی حیثیت رکھتے ہیں اسی لئے انہوں نے حکومت کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ان کی کتاب ''ولایۃ الفقیہہ'' کے صفحہ نمبر 49 پر وہ تحریر کرتے ہیں۔

''جب کوئی فقیہہ (مجتہد) جو صاحب علم ہو عادل ہو۔ حکومت کی تشکیل و تنظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو اس کو معاشرے کے معاملات میں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھے اور سب لوگوں پر اس کی سمع و اطاعت واجب ہوگی۔ اور یہ صاحب حکومت فقیہہ و مجتہد حکومتی نظام اور عوامی سماجی مسائل کی نگہداشت اور امامت کی سیاست کے معاملات میں اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبی اور امیر المومنین علیؓ علیہ السلام مالک و مختار تھے (الحکومۃ الاسلامیہ خمینی)۔

شیعہ مسلک میں نذر و نیاز اور مجالس کثرت سے کی جاتی ہیں۔ ایام محرم ان کے لئے رنج و الم کے دن ہوتے ہیں۔ مجالس میں شرکت اور غم حسین کا اظہار کرنے کو باعث نجات و مغفرت جانتے ہیں۔ اپنی ہر مشکل میں ہر کام کے لئے مدد ''علی'' سے مانگتے ہیں۔ حضرت علی کو حاظر و ناظر جانتے ہیں۔ شیعہ اثنا عشری فرقوں میں ایک فرقہ آغا خانی بھی ہے جو صرف حاضر امام آغا خان کو ہی سب کچھ مانتا ہے۔ آغا خان کا دیدار ان کی بخشش و نجات کا ذریعہ ہے۔ ان کی عبادات کا تمام تر محصور حاضر امام آغا خان ہی ہے۔

سب شیعہ ایک ہی طریقے کے نہیں ہوتے۔ کچھ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی آل کی شان میں غلو کرتے ہیں۔ کچھ معتدل اور میانہ رو ہیں چنانچہ معتدلین نے کسی دوسرے صحابی کی تکفیر کے بغیر محض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اعلان و عقیدے پر اکتفا کیا ہے وہ شیعہ جو غالی اور افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو درجہ نبوتؐ پر پہنچا دیا۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ نبوتؐ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تھی لیکن

جبرئیل علیہ السلام کو مغالطہ ہو گیا اور بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے۔ (یہ غالی فرقہ ہے جو اس طرح کہتا ہے)۔ (حالانکہ اس وقت تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کمسن تھے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس برس تھی)۔

ان میں بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کا ظہور یا خدا بھی مانتے ہیں۔ ایسے لوگ روسی ریاستوں میں زیادہ تر پائے جاتے ہیں

حنفی فقہ کی اشاعت دیگر مسالک سے زیادہ کیونکر ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ عباسی خلفاء نے اپنے دور میں اپنے محکمہ عدل وقضا کے لیے حنفی فقہ کو ہی منتخب کیا تھا اور اہلِ عراق اکثر اسی مسلک کے مقلد تھے۔ اور سلطنت عثمانیہ کا سرکاری مذہب بھی یہی تھا۔ اور جو ممالک سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت تھے وہاں بھی یہی مسلک حنفی سرکاری مذہب کے طور پر رائج ہوا۔

برصغیر پاک وہند میں گو کہ ہر مسلک کے پیروکار موجود ہیں لیکن ان میں اکثریت حنفی مسلک کے ماننے والوں کی ہے فقہ اسلامی پر اجتہادی اور تحقیقی پیش رفت جتنی فقہ حنفی میں ہوئی اور علم عمل کے میدان میں اسلامی قوانین کی اس طرح برتری ثابت کی گئی جو قرآن وسنت کے عین مطابق تھی اور صاف شفاف پیرائے میں تھی جس سے مسائل آسانی سے حل ہوئے اور سمجھ میں آنے لگے جس کے باعث زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دینی مسائل حل ہونے لگے۔ اس سے اظہارِ دین اور غلبہ دین ہوا۔ امام ابوحنیفہ نے ہر دینی ضرورت کے مطابق فقہی مسائل کو حل کیا ہے اسلام کی بنیاد پانچ اہم ارکان پر ہے۔ (۱) ایمان۔ (۲)۔ نماز۔ (۳)۔ روزہ۔ (۴)۔ زکوٰۃ۔ (۵)۔ حج۔ آئندہ صفحات میں بنیادی اسلامی ارکان پر فقہ حنفی کے مطابق تشریح پیش کی جائے گی اس کے علاوہ اسلامی نظام زندگی کے لیے معاشرتی اقتصادی معاملات جرم و سزا سے متعلق بھی تشریح پیش کی جائے گی تمام تشریحات کو مختصراً مختصراً ہی تحریر کیا جا سکے گا کیونکہ

یہ مختصر سا کتابچہ زیادہ تفصیل وتشریح کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ یہ کتابچہ حضرت امام اعظمؒ کی شخصیت اور اُن کے فن فقہ کے بارے میں مختصر معلومات پر ہی محیط ہے۔ سب سے پہلے ہم اسلامی اساسی معاملات پر بحث کریں گے۔ ایمان کے بعد نماز اسلام کا دوسرا سب سے اہم رکن ہے اب ایمان سے متعلق حنفی مسلک اور پھر طریقہ نماز پر گفتگو کریں گے۔

ایمان

حضرت امام راغب اصفہانیؒ کے نزدیک ایمان کا مطلب ہے زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا اور اپنے عمل سے ظاہر کرنا کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک حقیقی اور اکیلا ہے۔ اُس کا کسی طرح سے کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام عبادات کے لائق ہے۔ ہر چیز پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔ اُس کے ہی حکم کے مطابق ہمیں اپنی زندگی گزارنا ہے۔ وہ مالک و خالق ہے اور روز آخرت ہم سے حساب لے گا اور اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے اپنے احکام اپنے رسولوں پیغمبروں کے ذریعے پہنچائے۔ وہ سب سچے اور معصوم تھے۔ ان کو برحق تسلیم کرنا اُن پر ایمان لانا اور فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا گمراہ انسانوں کی رہنمائی‘ فلاح اور بہتری کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو آسمانی کتابیں نازل فرمائیں اُن تمام پر ایمان لانا اور انہیں برحق جاننا اور روز قیامت پر اور دنیا کی زندگی کے بعد آنے والی دائمی زندگی اور روز جزا و سزا یعنی یوم حساب پر ایمان لانا۔ یہی اسلام کی پانچ بنیادی ایمانیات ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں ایمانیات کا حصہ بنیادی ہے۔ ایمان کا اقرار کرنا دراصل اپنے آقا و مالک کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کا نصب العین اپنے خالق و مالک کی خوشنودی‘ اپنے صالح اعمال کے ذریعے حاصل کرنا ہے۔ ایسے تمام طور طریقوں کو معلوم کرنا‘ اپنانا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ اللہ نے اپنے بندوں کی فلاح و بہبود اور آخرت میں نجات کا بندوبست کرنے کے لیے ہی اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آخری کتاب قرآن حکیم دے کر اپنے دین کی تکمیل فرما دی اور قرآن حکیم میں انسانوں کی بھلائی‘ بہتری کے تمام امور کھول کھول کر بیان فرما دیے ہیں۔ ایمان ہی وہ بنیاد ہے جس پر

مسلمان اور اسلام کی پوری کی پوری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ قرآن حکیم میں ایمان کی تفصیل بیان فرما دی گئی۔ اللہ پر ایمان اس کے رسولوں پر ایمان اُس کے فرشتوں پر ایمان اُس کی کتابوں پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان۔ اگر کوئی انسان ایمان کی دولت سے محروم ہے تو اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے ایمان کو نہ اپنا کر جو راستہ اپنے لیے چنا ہے وہ آگ کا، جہنم کا، عذاب الٰہی کا راستہ ہے۔ کفر ایمان کی ضد ہے اور کفر اللہ کی ناراضگی کا موجب ہے۔

ایمان کے تمام ارکان پر تمام فقہا تمام علماء اور آئمہ متفق ہیں۔ کسی جز ایمان پر کوئی اختلاف نہیں۔ بعض نے نبوت کے ابتدائی دور کے اعمال کو نمونہ بنالیا۔ کسی نے اس کے بعد کے دور کے اعمال کو اور کسی نے آخری دور کو جب دین اسلام اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ تمام اختلافات کے باوجود اختلافی اعمال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی منسوب ہیں۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل آخری دور کے بارے میں جب دین اسلام مکمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حج الوداع کے موقع پر تکمیل دین کی نوید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا دی۔ اُسی دور کو امام ابوحنیفہؒ نے اپنے لیے اور اپنے مقلدین کے لیے کامل نمونہ جانتے ہوئے تسلیم کیا ہے۔ اسی دور کے بارے میں تحقیق کی اور نص قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کو ہر عمل پر فوقیت و اہمیت دی اور اپنی رائے و قیاس کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا ہے جہاں قرآن و سنت خاموش ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز
وضو اور غسل

قرآن کریم کی رو سے انسان کی تخلیق کا اولین مقصد عبادت الٰہی ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی سورۃ الذاریات میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرما رہا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ترجمہ) میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں (الذریت۔۵۶) سورۃ النحل میں رب کائنات اسی طرح اپنے بندوں کو تاکید فرما رہا ہے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا (ترجمہ) صرف اللہ کی عبادت کرو اس کی سوا تمام معبودوں سے بچو (النحل۔۳۶)۔ قرآن کریم کے ان احکام الٰہی کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عبادت ہم پر فرض کی ہے وہ اور اس کی اصل روح کیا ہے؟ اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان اللہ واحد کا بندہ و مخلوق ہے۔ وہی اس کا مالک' رازق و پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کا ایسا مالک وخالق ہے جو نا صرف ان کی پرورش کا انتظام فرماتا بلکہ ان کے لیے ہر ہر آسائش وضرورت کا بھی پورا پورا خیال رکھتا ہے۔ وہی ہے جس کے پاس ہر قسم کا اختیار واقتدار ہے اس لیے وہی ہماری ہر قسم کی عبادات کا حق دار ہے۔ اسلام کا تصور عبادت بھی یہی ہے کہ انسان اپنی ساری زندگی ایک اکیلے اللہ کی عبادت کرے اور انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا کل وقتی ملازم اطاعت گزار سمجھے اس کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ اللہ کی عبادت و اطاعت سے خالی نہ رہے۔ احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی کا تمام نظام اختیار کرے۔ اٹھنا' بیٹھنا' سونا' جاگنا' چلنا' پھرنا' کھانا' پینا غرض سب کچھ اللہ کی شریعت کی پابندی کرتے گزارے ایک ایک کام ایک ایک بات حکم الٰہی کے تابع اور اس کی مقرر کردہ حدوں میں ہو۔

اسلام انسان کی پوری کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے شعور میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ اللہ کا بندہ وغلام ہے۔ اس کا دشمن ازلی شیطان اس کے چاروں طرف اُسے بہکانے بھٹکانے کے لیے پھر رہا ہے اُس سے اسی طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی شعوری کوشش سے اللہ کی بندگی کا اظہار واقرار کرتا رہے اس اقرار واظہار کے لیے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے نماز کی تعلیم فرمائی۔ نماز سے فرض شناسی اور مستعدی پیدا ہوتی ہے اور فرماں برداری کے ساتھ اطاعت گزاری اور اللہ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ احکام الٰہی کو ماننے والا اللہ کے سپاہی کی مانند ہوتا ہے اور احکم الحاکمین کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے رات و دن مصروف عمل رہتا ہے اور صرف ایک اللہ کے لیے ہر قسم کی شیطانی قوتوں سے مسلسل لڑتا رہتا ہے جس طرح فوج کا سپاہی قاعدے قرینے ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے اور اپنے آفیسر کے حکم کا تابع فرمان ہوتا ہے بالکل ایسے ہی ایک مسلمان بھی اللہ کی فوج کا سپاہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام کوئی اعتقادی دین یا مسلک نہیں ہے بلکہ یہ تو مسلسل عملی خدمت واطاعت گزاری اور بندگی کا مذہب ہے اور اسلام میں نماز ایسی عبادت ہے جو انسان کی سیرت کو ایک خاص انداز عطا کرتی ہے۔ جو عبادت الٰہی کے لیے ضروری ہے۔ نماز سے انسان میں تقویٰ' طہارت' پاکیزگی' نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ نماز مسلمان کی دینی تربیت کا اہم حصہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ کا خوف بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی مسلمان نماز کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہے۔ آیا وہ پاک صاف ہے۔ نجس تو نہیں ہے۔ کپڑے پاک صاف ہیں۔ گندے یا نجس تو نہیں۔ وضو ہے کہ نہیں ہے۔ غور کرنے کے لیے باتیں کافی ہیں۔ اگر انسان یوں ہی بے وضو بغیر طہارت و پاکیزگی کے نماز میں کھڑا ہو جائے تو اسے کون پکڑ سکتا ہے۔ سوائے اللہ کے کسی اور کو تو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی چونکہ نماز انسان میں خوف الٰہی پیدا کرتی ہے اس لیے وہ ان

تمام چیزوں کی پاکیزگی کا وضو کا اور لباس کا خیال کرتا ہے۔

نماز کے لیے انسان کا پاک صاف ہونا لازمی ہے۔ طہارت یعنی پاکیزگی خود ایک عبادت ہے کیونکہ پاکیزگی نہ صرف نماز کے لیے بلکہ تلاوت قرآن کریم اور طواف کعبہ کے لیے بھی ضروری ہے۔ پاکیزگی کے بغیر نہ تو نماز ہوگی نہ تلاوت کلام پاک کر سکتے ہیں اور نہ طواف کعبہ شریف ہی کر سکتے ہیں۔ ان سب کے لیے پاکیزگی لازمی شرط ہے اس کی اہمیت قرآن کریم اور احادیث نبویؐ سے ثابت ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں رب کائنات فرما رہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ ۲۲۲) ترجمہ: اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ طہارت کے لفظی معنی پاکیزگی کے ہیں۔ اسلام میں ایمان لانے کے بعد سب سے پہلے جو چیز فرض کی گئی وہ نماز کی ادائیگی کے لیے طہارت و پاکیزگی ہے۔ طہارت کا مطلب ہے اپنے بدن کو نجاست یعنی گندگی سے پاک کرنا اور شریعت کے مطابق تین اعضاء یعنی منہ ہاتھ پیروں کا دھونا اور سر کا مسح کرنا ہے اور پانی میسر نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کے ذریعہ پاکیزگی حاصل کرنا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ پاکیزگی کو بہت پسند فرماتا ہے۔ ایک اور جگہ قرآن حکیم میں سورۃ توبہ میں فرمایا گیا۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (التوبہ ۱۰۸) ترجمہ: اس میں ایسے بندے ہیں جو بڑے پاکیزگی پسند ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک و صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث شریف حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے ارشاد فرمایا کہ طہارت و پاکیزگی جزو ایمان ہے۔ پاکیزگی اور طہارت کے بعد وضو کرنا لازمی امر ہے۔ یہ عبادات الٰہی کے لیے ضروری اور اہم ترین عنصر ہے۔ رب کائنات خود قرآن حکیم میں وضو کا طریقہ تعلیم فرما رہا ہے کہ وضو کس طرح کرنا ہے۔ یہاں مختصراً احادیث کے حوالوں سے وضو کی اہمیت کو اجاگر کرنا

ہے۔ ذیل میں سورۃ المائدہ کی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کو نہ صرف وضو کا طریقہ تعلیم فرما رہا ہے۔ ساتھ ہی ناپاکی سے پاک وصاف ہونے کا طریقہ بھی تعلیم فرما رہا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْاؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُؕ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَ لِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو اور اگر جنابت کی حالت ہو تو غسل کرلو۔ ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم سے کوئی حاجت ضروری سے فارغ ہوا ہو یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کرلو اسے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مل لو اللہ تم پر کسی قسم کی تنگی کرنا نہیں چاہتا' بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے اور تمہیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔ (المائدہ۔ ۶)

مفسّرین کی رائے میں وضو کرتے ہوئے اعضاء کو ترتیب وار دھویا جائے یعنی ایک عضو دھونے کے بعد دوسرے عضو کو دھونے میں دیر نہ کی جائے سب کے سب اعضا تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے دھوئے جائیں۔ تمام اعضاء کو اس طرح دھویا جائے کہ ان کا کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے (ورنہ وضو نہ ہوگا) وضو کرنے سے پہلے نیت کرے۔ بسم اللہ شریف پڑھے اور ہر اعضاء کو تین بار دھولے۔ داڑھی گھنی ہو تو خلال کرے۔ قرآن حکیم میں وضو کا

طریقہ بتایا گیا ہے کہ "اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو۔ اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔ یہ وضو کے فرائض ہیں۔ وضو کی سنتیں اور واجبات کا تعین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور تفصیل اپنے عمل کے ذریعہ سکھائی' بتائی اور سمجھائی ہے۔ ایک حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مسلم اور بخاری میں مروی ہے۔

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن اس طرح وضو فرمایا کہ پہلے دونوں ہاتھوں پر تین دفعہ پانی ڈالا (انہیں دھویا) پھر کلی اور ناک میں پانی لے کر اس کو نکالا اور ناک کی صفائی کی پھر تین دفعہ اپنا پورا چہرہ دھویا اس کے بعد داہنا ہاتھ کہنی تک تین دفعہ دھویا پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین دفعہ دھویا' اس کے بعد سر کا مسح کیا پھر داہنا پاؤں تین دفعہ دھویا پھر اسی طرح بایاں پاؤں تین دفعہ دھویا (اس طرح پورا وضو کرنے کے بعد) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل ایسے ہی وضو کیا جیسا کہ میں نے کیا پھر دو رکعت نماز اس وضو کی ایسی پڑھی جو حدیث نفس سے خالی رہی (یعنی دل میں ادھر ادھر کی باتیں نہیں سوچیں) تو اس طرح پچھلے تمام گناہ معاف ہو گئے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ایک اور حدیث شریف حضرت ابو حیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے وضو اس طرح فرمایا کہ پہلے اپنے دونوں ہاتھ اچھی طرح سے دھوئے یہاں تک کہ ان کو خوب اچھی طرح صاف کر دیا' پھر تین دفعہ کلی کی' پھر تین دفعہ ناک میں پانی لے کر اس کی صفائی کی' پھر چہرے اور دونوں ہاتھوں کو تین تین مرتبہ دھویا پھر ایک دفعہ سر کا مسح کیا' پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے اس کے بعد آپ کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہی کھڑے آپ نے وضو کا بچا ہوا پانی پی لیا۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس طرح پورا وضو کر کے دکھانے کے بعد فرمایا۔ "میں نے چاہا کہ تمہیں دکھاؤں کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

وضو کے فرض تو چار ہی ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ المائدہ میں آ چکا ہے یعنی چہرے کا دھونا ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا سر کا مسح کرنا پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا۔ ان چار چیزوں کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں جن چیزوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور جن کی ترغیب دیا کرتے تھے وہ وضو کی سنتیں اور اس کے آداب ہیں جن سے وضو کی ظاہری اور باطنی تکمیل ہوتی ہے۔ جیسے چہرے اور ہاتھ پاؤں کو بجائے ایک ایک مرتبہ دھونے کے تین تین بار دھونا اور مل مل کر دھونا داڑھی میں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنا، انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو حرکت دینا تا کہ پانی اس کے نیچے پہنچ جائے اور کسی جگہ کے خشک رہنے کا شبہ نہ رہے اس طرح کلی اور ناک کی صفائی کا اہتمام کرنا، کانوں کے اندرونی اور بیرونی حصے کا مسح کرنا اور وضو شروع کرتے وقت بسم اللہ والحمد للہ پڑھنا اور آخری کلمہ شہادت پڑھنا اور وضو کی تکمیل کی دعا پڑھنا یہ سب کی سب وضو کی سنتیں اور آداب ہیں جو مستحبات ہیں جن سے وضو کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک حدیث حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت ہے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اللہ کا نام لیے بغیر وضو کیا اس کا وضو ہی نہیں ہوا۔ (جامع ترمذی۔ ابن ماجہ) ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ "کہ جو شخص وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام لے، تو یہ وضو اس کے سارے جسم کو پاک کر دیتا ہے اور جو کوئی وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام نہ لے تو وہ وضو اس کے صرف اعضائے وضو کو ہی پاک کرتا ہے۔ (سنن دار قطنی)

وضو کے ارکان کے بارے میں مختلف مسالک کے درمیان کوئی بڑا یا اہم فرق نہیں پایا جاتا۔ فقہ جعفریہ میں دونوں ہاتھ گٹے تک دو مرتبہ دھوتے ہیں۔ تین بار کلی کرتے ہیں تین بار ناک میں پانی ڈالتے ہیں پھر وضو کی نیت کرتے ہیں پھر منہ کو پانی سے دھوتے ہیں، پھر دونوں بازو کہنی تک دھوتے ہیں۔ اس کے بعد سر کا مسح تالو سے سر کے آخر تک کرتے ہیں پھر پاؤں کا مسح کرتے ہیں۔

غسل کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے قول وعمل سے وضو کا طریقہ اور اس کے آداب سکھائے اور بتائے ہیں اسی طرح غسل کا طریقہ اور اس کے آداب بھی تعلیم فرمائے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے تو سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے تھے، پھر بائیں ہاتھ سے مقام استنجاء کو دھوتے اور داہنے ہاتھ سے اس پر پانی ڈالتے تھے پھر وضو فرماتے تھے اسی طرح جس طرح نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے' پھر پانی لیتے اور بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈال کر پانی پہنچاتے یہاں تک کہ آپ سمجھتے کہ پانی سب جگہ پوری طرح پہنچالیا ہے تو دونوں ہاتھ بھر بھر کر تین دفعہ اپنے سر پر پانی ڈالتے اس کے بعد پورے جسم پر پانی بہا لیتے' اس کے بعد دونوں پاؤں دھو لیتے (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری خالہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کے لیے پانی بھر کر آپ کے پاس رکھا تو آپ نے پانی کے اُس برتن سے سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دو دفعہ یا تین دفعہ دھوئے پھر اپنا دھلا ہوا ہاتھ پانی کے اس برتن میں ڈالا اور اس سے پانی لے کر اپنے مقام استنجاء پر ڈالا اور بائیں ہاتھ سے اسے دھویا' پھر اپنا بایاں ہاتھ زمین پر مارا اور اس کو خوب مٹی سے ملا اور رگڑا' پھر وضو کیا۔ جیسے کہ آپ نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تین دفعہ اپنے سر پر پانی لپ بھر بھر کر ڈالا پھر

اپنے سارے جسم کو دھویا۔ پھر اس جگہ سے ہٹ کر آپ نے اپنے دونوں پاؤں دھوئے پھر میں نے آپ کو رومال دیا تو آپ نے واپس کر دیا۔ (صحیح بخاری۔ صحیح مسلم)

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ ان احادیث مبارکہ سے رسول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا طریقہ پوری تفصیل سے معلوم ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دو یا تین دفعہ دھوتے تھے اس کے بعد مقام استنجاء کو بائیں ہاتھ سے دھوتے اور اپنے داہنے ہاتھ سے اس پر پانی ڈالتے اس کے بعد بائیں ہاتھ کو مٹی سے مل مل کر رگڑ رگڑ کر خوب اچھی طرح دھوتے۔ پھر وضو فرماتے۔ یعنی تین تین دفعہ کلی کر کے اور ناک میں پانی دے کر اس کی اچھی طرح صفائی کر کے منہ اور ناک کے اندرونی حصہ کو غسل دیتے اور ریش مبارک میں خلال کر کے ایک ایک بال کو خوب اہتمام سے دھوتے تاکہ ہر بال کی جڑ تک پانی پہنچ جائے اس کے بعد سارے جسم کو غسل دیتے اور غسل کی جگہ سے ہٹ کر پاؤں کو دوبارہ دھوتے۔

نماز

نماز تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شروع سے ہی پڑھتے رہے تھے البتہ پانچ وقت کی نماز باقاعدہ شب معراج میں حکم الٰہی سے فرض ہوئی۔ نماز دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تبارک تعالیٰ کی جانب سے تحفۂ معراج ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملاقات کے شرف کے وقت عطا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق آ کر آپ کو نماز کے اوقات بتائے اور نماز پڑھنے کا

طریقہ سکھایا۔ قرآن کریم میں نماز کی فرضیت صریح الفاظ میں آئی ہے یہ تمام عبادات سے افضل عبادت ہے۔ اس کی بڑی تاکید فرمائی گئی ہے۔ نماز کی فرضیت سے انکار کرنے والا اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات عالی کی صفات وکمالات واحسانات اس کی توحید وتقدیس کے بارے میں جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور سمجھایا ہے اسے مان لینے اور اس پر ایمان لے آنے کا پہلا اور فطری تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور اپنی اطاعت و بندگی عجز و عاجزی کا اظہار کرے اور اپنی اطاعت اور بندگی کے ذریعے رب کائنات کی رحمت ورضا حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اسی اطاعت و یاد سے اپنی زندگی قلب ونظر کو منور کرے۔ نماز کا اصل موضوع یہی ہے۔ نماز بندے کی اظہار بندگی واطاعت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے اس لیے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں ہر آسمانی کتاب میں ایمان کے بعد سب سے پہلا حکم نماز کا ہی دیا گیا اور اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری شریعت محمدیؐ میں بھی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کو اتنی اہمیت دی گئی ہے جو کسی اور عبادت واطاعت کو نہیں دی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب حجتہ اللہ البالغہ میں نماز کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ نماز اپنی عظمت شان اور مقتضائے عمل وفطرت ہونے کے لحاظ سے تمام عبادات میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور اللہ کے بندوں کے لیے سب سے زیادہ معروف و مشہور نفس کے تزکیہ وتربیت کا ذریعہ ہے اور سب سے زیادہ نفع مند ہے۔ اسی لیے شریعت نے اس کی فضیلت اس کے اوقات کے تعین وتحدید اور اس کے شرائط وارکان آداب ونوافل اور اس کی رخصتوں کے بیان کا وہ اہتمام کیا ہے جو عبادات واطاعات کی کسی دوسری قسم کے لیے نہیں کیا۔ انہیں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے نماز کو دین کا عظیم ترین شعائر اور امتیازی

نشان قرار دیا گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ معمول اور اصول اول تھا کہ جب کسی معاملے میں معتبر اور صحیح احادیث موجود ہوں جو کہ کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہوں۔ کبارِ تابعین سے روایت ہوں تو ان کی موجودگی کی دلیل کے باعث وہ قیاس نہیں فرماتے تھے اس لیے ذیل میں نماز کے بارے میں احادیث کے حوالے سے ہی نماز کی فضیلت و اہمیت اور طریقہ پر بات ہوگی۔

نماز کی اہمیت کے بارے میں چند احادیث

نماز کے واجب ارکان کیا ہیں؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''کہ بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے کا ہی فاصلہ ہے۔'' (صحیح مسلم) ایک اور حدیث حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے اور اسلام قبول کرنے والے عام لوگوں کے درمیان نماز کا عہد و میثاق ہے (یعنی ہر اسلام لانے والے سے ہم نماز کا عہد لیتے ہیں جو ایمان کی خاص نشانی اور اسلام کا شعار ہے) پس جو نماز چھوڑ دے تو گویا اس نے اسلام کی راہ چھوڑ کر کفر کا طریقہ اختیار کرلیا۔ (ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کبھی کسی چیز کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہارے ٹکڑے کردیئے جائیں اور تمہیں آگ میں بھون دیا جائے اور خبردار کبھی بلا ارادہ نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جس نے دیدہ و دانستہ اور عمداً نماز چھوڑ دی تو اس کے بارے میں وہ ذمہ داری ختم ہوگئی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے وفادار اور صاحب ایمان بندوں کے لیے ہے اور خبردار شراب کبھی نہ پینا کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔ (ابن ماجہ)

اللہ تبارک وتعالیٰ بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑے فضل و کرم کا معاملہ بڑی شفقت ومحبت سے فرماتا ہے ہر اہل ایمان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری کسی بھی طرح کی کسی عبادت و ریاضت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب

کچھ عبادت کی پابندیاں تو خود ہمارے مفاد میں ہماری فلاح و بہتری کے لیے ہیں تا کہ اس کے بندے اچھا کام کریں تو انہیں زیادہ سے زیادہ اور اچھا معاوضہ دیا جائے۔ اسی بات کو اہل عقل و دانش اگر فکر کی عینک سے دیکھیں تو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہر حکمران اور حکومت کے اپنی رعایا پر کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ حقوق رعایا کے ہوتے ہیں۔ رعایا جب تک ملک و حکومت کی اطاعت گزار و تابعدار رہتی ہے حکومت اُس کی حفاظت و نگہداشت اور پرورش کے انتظامات کرتی رہتی ہے اور اگر رعایا کسی طرح بغاوت خودسری خودمختاری جیسی راہ اختیار کرتی ہے تو وہ حکومت اور حکمران کی باغی تصور کی جاتی ہے اور مجرم گردانی جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی مالک الملک رب کائنات پروردگار عالمین نے تمام اہل ایمان جو اس ذات عالی پر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی کتاب مبین پر ایمان لائے اور اسلام قبول کیا ان کے لیے بہت ہی زیادہ عالی شان مراعات دائمی کا اللہ تبارک و تعالیٰ نے اعلان فرما رکھا ہے۔ وہ انعامات الٰہی جو ہر اہل ایمان کو اس کی دائمی زندگی کے عیش و آرام اور ہر قسم کی آسائشوں سے وابستہ ہیں ان دائمی انعامات الٰہی کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو ہدایات فرمائیں ہیں وہ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ذریعہ ہی پہنچی ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے اندازہ ہو رہا ہے کہ نماز اہل ایمان کے لیے کتنی اہم اور ضروری عبادت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالدردہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے تمام اہل ایمان کو ہدایت فرمائی کہ دیدہ و دانستہ نماز کا چھوڑ دینا دوسرے تمام گناہوں کی مانند صرف ایک گناہ نہیں ہے بلکہ نماز کا چھوڑنا سرکشی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے مالک و آقا سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے اور جو شخص اپنے مالک سے بغاوت و سرکشی کرے گا وہ خود سوچ سمجھ سکتا ہے کہ پھر وہ اپنے مالک و آقا کی عنایات فضل و کرم کا کیسے مستحق ٹھہر سکتا ہے۔ ان احادیث میں ترک نماز کو کفر یا ملت سے خروج اس بناء پر کہا گیا ہے کہ نماز

ایمان کی اہم نشانی ہی نہیں بلکہ اسلام کا خاص الخاص شعار بھی ہے اس کے چھوڑنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص اسلام سے ملت اسلامیہ سے لاتعلق اور الگ ہو گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق نماز چھوڑ دینے والا شخص کافر ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جو بندہ نماز اہتمام سے ادا کرے گا تو وہ (نماز) قیامت کے دن اس کے واسطے نور ہوگی (جس سے قیامت کے اندھیروں میں اسے روشنی میسر آئے گی اور اس کے ایمان اور اللہ تعالیٰ سے وفاداری اور اطاعت کی نشانی ہوگی) اور دلیل ہوگی' اور اس کے واسطے نور ہوگی اور اس کے لیے نجات کا ذریعہ بنے گی اور جس شخص نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا تو اس کے واسطے نماز نہ نور بنے گی' نہ برہان اور نہ ہی ذریعہ نجات' اور وہ بد بخت قیامت میں قارون' فرعون، ہامان اور (مشرکین مکہ کے سرغنہ) ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ (مسند درامی۔ شعب الایمان بیہقی)

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ کے فقہ کے مطابق نماز کس طرح پڑھی جائے اس کا جواب کئی احادیث معتبر صحیحہ سے مل جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ایک جانب تشریف فرما تھے کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور اس نے نماز پڑھی اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا پھر جا کر نماز پڑھو تم نے ٹھیک نماز نہیں پڑھی۔ وہ شخص واپس گیا اور اس نے دوبارہ نماز پڑھی وہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پھر فرمایا تم جا کے پھر نماز پڑھو' تم نے ٹھیک سے نماز نہیں پڑھی۔ اس شخص نے تیسری دفعہ میں یا اس کے بعد والی دفعہ میں عرض

کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتا دیجئے اور سکھا دیجئے کہ میں کس طرح نماز پڑھوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو پہلے خوب اچھی طرح وضو کرو پھر قبلہ کی طرف اپنا رخ کرو' پھر تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کرو اس کے بعد جو قرآن تمہیں یاد ہو اور پڑھنا آسان ہو تو وہ پڑھو۔اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ اس موقع پر آپ صلی اللہ عدیہ وسلم نے فرمایا سورۃ فاتحہ کہہ کر نماز شروع کرو اس کے بعد جو قرآن تمہیں یاد ہو اور پڑھنا آسان ہو وہ پڑھو پھر قرأت کے بعد رکوع کرو یہاں تک کہ مطمئن اور ساکن ہو جاؤ رکوع میں پھر رکوع سے اٹھو یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ مطمئن اور ساکن ہو جاؤ' سجدہ میں پھر اٹھو یہاں تک کہ مطمئن ہو جاؤ پھر اپنی پوری نماز میں یہی کرو (بخاری مسلم) یعنی ہر رکعت میں رکوع وسجود وقومہ وجلسہ اور تمام ارکان اچھی طرح اطمینان وسکون سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرو۔اور یہ واقعہ مشہور صحابی حضرت رفاعہ بن رافع کے بھائی خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ کا ہے (سنن نسائی)۔

اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پوری نماز نہایت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر سکون قلب کے ساتھ پڑھی جائے اور اگر نماز پڑھنے میں جلدی کی اور اس طرح نماز پڑھی کہ نماز پوری طرح درست طریقے پر ادا نہ ہو سکے یعنی رکوع وسجدہ میں عجلت کی گئی ہو یا درست ادا نہ ہوئے ہوں اور جتنا وقفہ ہر رکن کے درمیان ضروری ہے نہ دیا گیا ہو تو ایسی نماز قابل اعتبار نہیں ہوگی۔اب دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح ادا فرماتے تھے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ سے نماز شروع فرماتے تھے اور قرأت کا آغاز سورۃ فاتحہ الحمد اللہ رب العالمین سے کرتے تھے اور جب آپ رکوع میں جاتے تو سر مبارک کو نہ تو اوپر کی جانب اٹھاتے اور نہ ہی نیچے جھکاتے بلکہ درمیانی حالت میں رکھتے تھے۔(یعنی کمر کے متوازی) اور جب رکوع سے

سر مبارک اٹھاتے تو سجدہ میں اس وقت تک نہ جاتے جب تک بالکل سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور جب سجدہ سے سر مبارک اٹھاتے تو جب تک بالکل سیدھے نہ بیٹھ جاتے دوسرا سجدہ نہیں فرماتے تھے اور ہر دو رکعت پر التحیات پڑھتے تھے اور اس وقت اپنے بائیں پاؤں کو نیچے بچھا لیتے اور داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے اور عقبہ الشیطان (یعنی دونوں پاؤں کھڑے کر کے بیٹھنا شیطان کی طرح) بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور اس بات سے بھی منع فرماتے تھے کہ آدمی (حالت سجدہ میں) اپنی باہیں زمین پر رکھے جس طرح درندے اپنی کلائیاں زمین پر بچھائے بیٹھتے ہیں (یعنی کلائیاں کہنیوں تک زمین پر نہ ٹکائی جائیں) اور پھر آپ السلام علیکم ورحمتہ اللہ کہہ کر نماز ختم کرتے تھے۔ (مسلم)

اس سے پہلے کہ ہم دوسری حدیث مبارک کی طرف رجوع ہوں ضروری ہے کہ اس حدیث مبارک میں ''عقبتہ الشیطان'' کی وضاحت کر دی جائے۔ شارحین اور فقہا نے اس کی دو طرح سے تشریح کی ہے۔ عقبتہ الشیطان سے مراد دونوں پاؤں کو پنجوں کے بل کھڑا کر کے ان کی ایڑیوں پر بیٹھنا چونکہ اس طریقے سے جلد بازی واستکبار کا اظہار ہوتا ہے اور اس طرح بیٹھنے سے نمازی کے صرف گھٹنے اور پنجے ہی زمین سے لگتے ہیں سب سے اہم بات یہ کہ اس طرح درندے یعنی کتے بھیڑیے وغیرہ بیٹھتے ہیں اس طرح بیٹھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے منع فرمایا ہے۔ ہاں اگر کوئی مجبوری ہو معذوری ہو تو پھر بلا کراہت جائز ہے۔

ایک اور حدیث مبارک جو صحابی رسول اللہ علیہ وسلم حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا۔'' مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یعنی اس کی تفصیلات آپ سب لوگوں سے زیادہ یاد ہیں۔ پھر فرمایا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ نماز شروع کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مونڈھوں تک لے جاتے اور جب

رکوع میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے' پھر اپنی کمر کو پوری طرح موڑ دیتے (بالکل سیدھی برابر کر دیتے) پھر جب رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو بالکل سیدھے اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ ریڑھ کی ہڈی کا ہر منکا (یعنی ہر جوڑ) ٹھیک اپنی جگہ پر آ جاتا' پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پر اس طرح رکھ دیتے کہ نہ ان کو زمین پر بچھا دیتے اور نہ ان کو سکیڑ لیتے اور پاؤں کی انگلیوں کا رخ سجدہ میں قبلہ کی جانب ہوتا تھا پھر جب دو رکعت پڑھ کر بیٹھتے تو داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے اور بائیں پاؤں پر بیٹھ جاتے۔ پھر آخری رکعت پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قعدہ آخیرہ کرتے تو اس طرح بیٹھتے کہ داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے بائیں پاؤں کو (اس کے نیچے سے) آگے کی جانب نکال دیتے اور اپنی سرینوں پر بیٹھ جاتے۔ (صحیح بخاری)

ایمان کے بعد اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے نماز ہماری زبان میں جانا پہچانا لفظ ہے۔ قرآن میں اسے صلوٰۃ کہا گیا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی کسی کی طرف رخ کرنا' بڑھنا' دعا کرنا' اور قریب ہونا اور قرآن کریم کی اصطلاح میں نماز کے معنی اللہ کی طرف متوجہ ہونا ہے' اس کی طرف بڑھنا' اس سے دعا کرنا اور اس کے انتہائی قریب ہونا اس طریقہ عبادت یعنی نماز کے ارکان کی تعلیم قرآن کریم میں خود رب کائنات نے دی ہے اس کی تفصیل کا طریقہ اور عمل اللہ کے محبوب نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اور سکھایا ہے جیسا کہ احادیث مبارکہ آپ کی نظروں سے گزر چکی ہیں رب کائنات قرآن حکیم میں اہل ایمان کو اپنا رخ درست کرنے اور قبلے کی طرف کرنے کی ہدایت اس طرح دے رہا ہے۔

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ

ترجمہ:۔ اور یہ کہ ہر سجدہ (نماز) کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی

عبادت اس طور کرو کہ یہ عبادت خالص اللہ کے واسطے ہو۔ (الاعراف۔ ۲۹)

سورہ العلق میں اس طرح کہا جارہا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩

ترجمہ:۔ اور سجدہ کرو اور (اللہ سے) قریب ہو جاؤ۔ (العلق۔ ۱۹)

مسلم کی ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے۔ ''بندہ اپنے رب سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ اللہ کے حضور سجدے میں ہوتا ہے۔ (مسلم)

بخاری کی حدیث میں یوں بیان ہوا ہے۔ ''تم میں سے جب کوئی نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ اللہ سے مناجات کرتا ہے۔ (بخاری)

نماز کا جو طریقہ اور اس کے ارکان' اذکار' اوقات' نماز کی رکعتیں اور تفصیلی طریقہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا' سکھایا اور عمل کے ذریعے سمجھایا' سکھایا جو احادیث شریف میں مستند حوالوں سے موجود ہے وہی درست اور ہر شک وشبہ سے محفوظ و بالاتر ہے۔ ایمان لانے کے بعد مسلمان سے اولین مطالبہ نماز قائم کرنے کا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمارہا ہے۔

إِنَّنِيٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدْنِى وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكْرِىٓ ﴿١٤﴾

ترجمہ:۔ بے شک میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی اور معبود نہیں پس میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔'' (طٰہٰ۔ ۱۴)

قرآن حکیم میں دیگر تمام عبادات سے زیادہ نماز کی تاکید کی گئی ہے اور اس کی اقامت پر زور دیا گیا ہے گویا ایمان کا دارومدار نماز پر ہی ہے۔ نماز ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے ایمان کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں ہے۔ ایمان لاتے ہی ہر مسلمان عاقل بالغ مرد عورت پر

چاہے وہ امیر ہو غریب ہو' تندرست ہو بیمار ہو پر فرض ہو جاتی ہے۔فرض نماز جماعت سے ادا کرنے کی تاکید ہے۔نماز ایمان کی لازمی علامت ہے۔ جہاں ایمان ہوگا وہاں لازماً نماز ہوگی اور جہاں نماز موجود ہے وہاں دین موجود ہے اور اگر نماز ضائع ہوگی تو پھر دین کی موجودگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز کی فضیلت واہمیت اسی وقت ہے جب اسے پورے ظاہر و باطن' آداب کے ساتھ پورے شعور سے ادا کیا جائے۔قرآن کریم میں نماز کی ادائیگی کے لیے اقامت ومحافظت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔اس کے معنی ہیں ادائیگی نماز میں نا صرف ظاہری آداب کا اہتمام کیا جائے اور باطنی صفات کا تعلق قلب وروح' احساسات وجذبات سے ہوتا ہے انسان اپنی پوری توجہ اور خلوص کے ساتھ اپنے رب کے حضور کھڑا ہوگا تو ہی اس کا فرض پوری طرح درست طریقہ سے ادا ہوگا اس کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ ٹھیک اوقات میں نماز ادا کرے اور پاک صاف ہو کر باوضو ہو کر جماعت کا اہتمام کرے اور پورے سکون' اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ارکان نماز ادا کرے۔انسان کو اپنی زندگی اللہ کی اطاعت وبندگی کے لیے تیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعوری طور پر یہ یاد رکھے کہ وہ ایک اللہ کا بندہ ہے اور اس دنیا میں اپنے اعمال کے ذریعے ایک اکیلے اللہ کی اطاعت وبندگی کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس دنیا میں اسے اپنے بندہ ہونے اور اللہ کا نائب اور اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرنا ہے اور اسے یہ بار بار دھرانا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کی بندگی کا اظہار بار بار نماز ادا کر کے کرنا ہے یعنی ٹھیک وقت پر نماز ادا کی جائے کیونکہ نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرما رہا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ:۔پس نماز قائم کرو یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔

(النساء۔۱۰۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''بہترین بندے وہ ہیں جو سورج کی دھوپ اور چاند تاروں کی گردش کو دیکھتے رہتے ہیں کہ نماز کا وقت فوت نہ ہو جائے۔(مسند حاکم)

حقیقت میں وہی لوگ نمازی کہلانے کے حق دار ہیں جو پابندی وقت اور اہتمام کے ساتھ بلاناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ المعارج میں کہا گیا ہے۔

إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ:۔مگر وہ نمازی جو اپنی نماز التزام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

(المعارج۔۲۲۔۲۳)

یہاں نمازی سے مراد وہ اہل ایمان مومن کامل ہیں جن میں اخلاقی کمزوریاں نہیں ہوتی۔نماز ہمیشہ وقت پر کسی کوتاہی وسستی کے بغیر ادا کرتے ہیں۔کسی قسم کی بھی مشغولیت وکام کی اہمیت انہیں نماز سے نہیں روکتی اور دنیا کا کوئی بھی فائدہ انہیں نماز سے غافل نہیں کرتا۔نمازی اپنی نماز کا پورا اہتمام اچھی طرح کرتا ہے۔

شرائط نماز سات ہیں اگران میں سے کوئی ایک شرط بھی رہ جائے گی تو نماز ادا نہیں ہوگی۔

(۱)۔بدن کا پاک صاف ہونا۔نجاست حقیقی اور حکمی دونوں سے پاک ہو۔وضو کی حاجت ہو تو وضو کیا جائے اور غسل کی ضرورت ہو تو غسل کیا جائے۔

(۲)۔ جو لباس زیب تن کیا جائے اس کا پاک ہونا لازمی ہے یعنی قمیص، پاجاما یا پتلون، عمامہ، ٹوپی، کوٹ، شیروانی، چادر، کمبل، موزے، دستانے وغیرہ۔

(۳)۔ جس جگہ نماز ادا کی جائے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔

(۴)۔ ستر کا چھپا ہونا یعنی جسم کے ان تمام حصوں کا چھپانا جن کا چھپانا ہر مرد اور عورت کے لیے فرض کیا گیا ہے۔

(۵)۔ جو نماز ادا کی جا رہی ہو اس کا وقت مقررہ ہو۔ ہر نماز اپنے وقت کے اندر ہی ادا کی جائے اگر وقت نکل جائے گا تو نماز قضاء ہوگی۔

(۶)۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو یہ یقین کر لیں کہ قبلے کی سمت درست ہے۔ اگر قبلے کی سمت کے علاوہ کسی اور طرف رخ کر کے اگر نماز پڑھی جائے گی تو ادا نہیں ہوگی۔

(۷)۔ نماز کی تیاری کے بعد جب نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو دل میں اس نماز کے لیے نیت کرنا اگر فرض نماز ہے تو فرض کی نیت کرنا اور اگر نفلی نماز ہے یا سنتیں ہیں اس کی نیت کرنا اور اگر قضاء نماز ادا کرنا ہے تو پھر قضاء نماز کی نیت کرے اور جس وقت کی قضاء ادا کرنا ہو تو اس وقت کا ارادہ بھی کرے۔ زبان سے نیت کرنا افضل ہے لیکن ضروری نہیں ہے امام کے پیچھے بھی نیت کرنا ضروری ہے۔

جس طرح نماز کی شرائط سات ہیں ایسے ہی نماز میں جو چیزیں فرض ہیں جنہیں ارکان نماز کہا جاتا ہے وہ بھی سات ہیں۔

(۱) تکبیر تحریمہ۔ یہ نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھا کے اللہ اکبر کہنا اسے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔ تکبیر کہتے ہی وہ تمام افعال جو اب تک حلال تھے حرام ہو جاتے ہیں یعنی چلنا پھرنا، آگے پیچھے ہونا۔ کھانا پینا، بات چیت کرنا، کھجانا، ناک میں انگلی ڈالنا، غرض تمام باتیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہی اسے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔

حنفی مسلک کے مطابق تکبیر تحریمہ کہنے کے فوراً بعد مرد ناف کے اوپر اور عورتیں سینے پر دونوں ہاتھ اس طرح باندھیں گے کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھیں اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے کلائی کو پکڑ لیں گے باقی تینوں انگلیاں کلائی پر سیدھی پھیلا دیں۔

حضرت امام شافعیؒ اور علماء اہل حدیث کے مطابق مردوں کو بھی سینے پر ہاتھ باندھنا ہی مسنون ہے۔ جبکہ فقہ جعفریہ کے مطابق دونوں ہاتھ کھلی حالت میں دونوں رانوں کے ساتھ سیدھے رکھے جاتے ہیں۔ اہل حدیث علماء کے مطابق ناف پر ہاتھ باندھنا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت علقمہ کے ذریعے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناف سے نیچے ہاتھ باندھے ہوئے دیکھا۔ اس حدیث کے راوی معتبر ہیں ان کی ملاقات بھی ثابت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ہاتھ ناف کے اوپر باندھنے میں انکساری' اطاعت و بندگی کا اظہار ہوتا ہے جبکہ ہاتھوں کو سینے پر باندھنے میں غرور و تکبر نخوت کا اظہار ہوتا ہے۔ حالت نماز میں تو بندہ اپنے معبود کے سامنے سراپا عجز و انکسار بندگی کی حالت میں کھڑا ہوتا ہے اور نماز میں اطاعت و بندگی کا اظہار ہی عبادت ہے۔

اگر ہم آج بھی کسی رئیس یا حکمران کے یہاں اُس کے دربان خدمت گاروں کو ایک نظر دیکھیں تو یہ بات ہماری سمجھ میں بہ آسانی آ جائے گی کہ وہ اپنے مالک کے سامنے اپنی اطاعت و خدمت گزاری کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ ہاتھ ناف پر یا زیر ناف باندھے ہوتے ہیں جس سے ان کی خدمت گزاری' انکساری و اطاعت کا اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سینے پر آر پار یعنی اس طرح سے ہاتھ باندھنا کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں دونوں کہنیوں کو چھو رہی ہوں یا انہیں اپنی گرفت میں لے رہی ہوں اور دونوں پاؤں کے درمیانی

فاصلہ بھی خوب کھلا ہو۔ ایسا صرف وہی پہلوان کرتے ہیں جو اپنی طاقت کے نشے میں چور ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی طاقت اور تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی چیز رب کریم کے لیے سخت ناپسندیدہ ہے کیونکہ تمام تکبر اور بڑائی صرف اللہ تبارک تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ وہ اپنے بندہ کو اپنی اطاعت و بندگی و انکساری کی ہی تعلیم فرمارہا ہے۔ اس لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ ہی سنت کے مطابق ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ضرورت محسوس کی تب ضرور ایسا کیا جب میدان جنگ میں دشمن سامنے قلعہ بند موجود ہوتا اور اسلامی فوج محاصرہ کی ہوتی جب نماز کا وقت ہوتا تھا تب دشمن کو مرعوب کرنے اس پر نفسیاتی طور پر اثر انداز ہونے کے لیے جیسے کہ نماز کے لیے وضو کرنے کے لیے دانت مسواک سے صاف کرنا اسؐ سے دشمن پر یہ تاثر پڑتا تھا کہ مسلمان ان کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اپنے دانت تیز کررہے ہیں۔ ایسے ہی اپنی قوت وشان کے اظہار کے لیے پہلوانوں کی طرح نماز کی صف بندی کی جاتی تھی تاکہ مسلمانوں کی قوت کی ہیبت دشمن کے دل میں بیٹھ جائے اور اس کا ایسا ہی اثر ہوتا بھی تھا لیکن زمانہ امن میں اور خصوصاً تکمیل دین کے وقت وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو امام ابوحنیفہؒ نے اختیار کیا۔ ایسا ہی مسئلہ رفع یدین کا ہے کہ یہ طریقہ مشرکین کے شرک کو پکڑنے اور ان کی شناخت کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔

رفع یدین۔ رفع کے معنی بلند کرنے کے ہیں جبکہ یدین ید کی جمع نہیں تثنیہ ہے یعنی دونوں ہاتھوں کو نماز میں بلند کرنا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ممتاز اور جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی تھی کہ وہ نماز میں پہلی صف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہوا کریں تاکہ نماز کے تمام اعمال اور طریقے کو اچھی طرح دیکھ لیں اور سمجھ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خاص عرصے تک معمول نماز میں رفع یدین کا بھی رہا ہے اور آپ نے رفع

یدین کو ترک بھی فرمایا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری نماز میں سوائے تکبیر تحریمہ کے کسی موقع پر رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جید صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلسل مطالعہ اور مشاہدے سے یہ سمجھا کہ نماز میں رفع یدین کو کثرت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک فرمایا اور تکمیل دین کے موقع پر آپ نے رفع یدین نہیں فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنایا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے وہ تمام عمل جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے میں اختیار فرمائے انہیں ہی اپنایا ہے کیونکہ ابتدائی اور درمیانی دور نبوت میں تو مختلف اعمال' مختلف وجوہات کے باعث وقتی طور پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی اختیار فرمائے گئے اور جب تکمیل دین ہوئی تو تمام اعمال وافعال پوری طرح مکمل ہو چکے تھے ان کے احکام وطریقے واضح ہو چکے تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے وہی تکمیل شدہ اعمال وافعال کو اپنایا ہے۔ جبکہ دیگر آئمہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جس دور رسالت کو بہتر سمجھا انہیں اپنایا ہے۔ فقہ جعفریہ میں آئمہ اربعہ سے اختلافات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں کیونکہ فقہ جعفریہ میں امام زمانہ کی بات واعمال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور قریبی صحابہ کرام میں سے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے مطالعہ سے یہ سمجھ لیا تھا کہ رفع یدین وقتی اور عارضی ضرورت کے طور پر اختیار فرمایا گیا تھا۔ جبکہ ابتدائی دور میں منافقین اپنی آستینوں میں بتوں کو چھپا کر نماز میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد سے روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ہم سے کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہم وسلم والی نماز

پڑھاؤں۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں نماز پڑھائی۔ اس نماز میں انہوں نے بس پہلی دفعہ (تکبیر تحریمہ کے ساتھ) رفع یدین کیا اس کے سوا رفع یدین بالکل نہیں کیا۔ (جامع ترمذی، سنن ابن داؤد، سنن نسائی)

امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات پر زور دیتے ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ پوری عمر کو پہنچ چکے تھے اور نبی کریم کے ارشاد کے مطابق پہلی صف میں نبی کریم کے قرب میں جگہ پاتے تھے جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا محض آغاز تھا۔ ان کو دوسری یا تیسری صف میں جگہ ملتی تھی۔ اس لیے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرکات وسکنات سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکے تھے جس طرح کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مواقع ملے امام محمد موطاً اور دیگر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایات پر انحصار کرتے ہیں۔

(۲)۔ قیام۔ نماز کی ادائیگی کے لیے سیدھا کھڑا ہونا۔ نماز میں اتنی دیر کھڑا ہونا فرض ہے جتنی دیر میں قرآن کریم کی اتنی قرآت ہو سکے جتنی کہ فرض کی گئی۔ قیام صرف فرض اور واجب نمازوں میں فرض ہے۔ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے۔

(۳)۔ نماز میں قرأت قرآن۔ قیام اور رکوع سجود کی طرح قرآن کریم کی قرآت بھی نماز کا ایک لازمی جزو اور بنیادی رکن ہے جو نماز میں قیام کی حالت میں کی جاتی ہے اور قرآت قرآن حکیم کی ترتیب اس طرح سے ہے تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثناء تسبیح وتقدیس کرنا اور اپنی عبودیت کے اظہار کے لیے کوئی دعا اللہ تعالیٰ سے عرض کرنا۔ (سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالىٰ جدك ولاالٰه غيرك) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو پہلے اللہ کی تسبیح اور حمد اس طرح بیان فرماتے "سبحانك اللهم

وبحمدك ''یعنی نام پاک بڑا برکت والا ہے۔اور تیری شان بہت اعلیٰ ہے اور تو ہی معبود برحق ہے تیرے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں۔(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

حمد و ثنا کے بعد قرآن کریم کی سب سے پہلی سورہ یعنی سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی صفات کا بڑا جامع اور موثر بیان ہے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے ساتھ توحید الٰہی کا اقرار اور اپنی ضرورت اور محتاجی حاجت مندی عاجزی اور فقیرانہ سوال اور دعا بھی ہے۔سورہ فاتحہ اپنی جامعیت اور خاص عظمت واہمیت کے باعث ہی نماز میں لازمی اور ضروری پڑھی جاتی ہے اس کے بغیر گویا نماز ہی نہیں ہوتی اس کے بعد کوئی بھی سورہ یا کسی بھی سورہ کا حصہ پڑھا جائے گا۔صحیح بخاری و مسلم میں ایک حدیث اس طرح نقل ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔''(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اس حدیث مبارکہ سے یہ بات طے پائی کہ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے اور اس کے بعد قرآن مجید سے کچھ اور بھی پڑھنا ضروری ہے۔اگر نمازی جماعت سے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو یعنی مقتدی ہو تو امام کی قرآت تمام مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوگی۔مقتدی کو خود قرآت کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں جماعت سے الگ تمام صورتوں میں نمازی کو سورۃ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے۔امام اعظم ابوحنیفہ بھی اس عمل کے قائل ہیں۔دوسری نماز میں بھی امام کی قرأت کو مقتدی کی طرف سے کافی سمجھتے ہیں۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث اس طرح روایت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ مقتدی لوگ اس کی اقتدا اور اتباع کریں لہٰذا جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرآت کرے تو تم خاموشی سے کان لگا کر

سنو۔'' (سنن ابی داؤد، سنن نسائی، ابن ماجہ)

امام کی قرأت کے وقت خاموشی سے سننے کی ہدایت بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی روایت ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور ہمارا طریقہ ہمیں وضاحت سے سمجھایا اور ہمیں نماز سکھائی ''پہلے صفیں سیدھی کرو پھر تم میں سے ایک امام بن جائے پھر جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش کھڑے ہو جاؤ۔'' اس حدیث مبارکہ کا ماخذ ومنشا قرآن کریم میں الاعراف کی اس آیت سے بھی پورا ہوتا ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔ (الاعراف۔۲۰۴)

آیت مبارکہ اور حدیث شریف سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ امام کے پیچھے خاموش کھڑے رہ کر قرأت سننا امام کی اقتدا کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ قرأت سنتے ہیں وہ گویا مقتدی ہیں کیونکہ مقتدی کا امام کا تابع ہونا ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہؒ تو دوسری نمازوں میں بھی امام کی قرأت کو مقتدی کے لیے کافی سمجھتے ہیں ان کا خاص استدلال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہے۔ جس کی امام محمدؒ امام طحاویؒ اور امام دار قطنیؒ نے خود امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ موطا امام محمدؒ کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرآت اس کی بھی قرآت ہے۔

یہ مسئلہ کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ الفاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اس مسئلے پر دونوں اطراف کے علماء نے بلا مبالغہ سینکڑوں کتب تحریر کی ہے اس سلسلے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ایک واقعہ نقل کرنے سے بات بڑی حد تک آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

ایک دن معتزلہ کے بہت سے لوگ جمع ہو کر امام ابوحنیفہؒ کے پاس انہیں قتل کرنے کے ارادے سے آئے اور چاہا کہ ان سے قرآت خلف الامام پر گفتگو کریں۔ ہر آدمی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ میں اتنے آدمیوں میں تنہا کیوں کر بحث کر سکتا ہوں ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے اس مجمع میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں جو سب کی طرف سے اس گفتگو کی خدمت کا کفیل ہو اور اس کی گفتگو کو پورے مجمع کی گفتگو سمجھی جائے گی۔ لوگوں نے امام صاحبؒ کی اس تجویز کو منظور کر لیا اور ایک شخص کو بحث کے لیے مختار بنا دیا گیا۔ اس پر امام اعظمؒ صاحب نے فرمایا۔ آپ نے یہ تسلیم کر لیا اور ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا مختار بنا دیا۔ اسی طرح امام نماز میں تمام مقتدیوں کی طرف سے قرآت کا کفیل ہے۔'' اس بات پر بحث کا خاتمہ ہو گیا اور مجمع نے آپ کے دلائل کو تسلیم کر لیا اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔

یہی عمل مسلک حنفی کے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ امام کے پیچھے تکبیر تحریمہ کہہ کر ثناء حمد پڑھ کر قیام میں خاموشی اختیار کرتے ہیں اور سورۃ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہتے ہیں۔

(۴)۔ رکوع۔ نماز کی ہر رکعت میں ایک مرتبہ رکوع کرنا فرض ہے۔ نماز دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور قلب وقالب' قول وعمل اپنے ظاہر وباطن کے ذریعے ایک خاص طریقے سے اپنی بندگی واطاعت اور نیاز مندی کا اظہار کرنا ہے۔ اور اللہ کی عظمت وجلالت

کے سامنے اپنی انتہائی تذلیل وفروتنی کے مظاہرے کا نام ہے۔ قیام رکوع وسجود یہ سب کے سب اعمال اپنی فروتنی بندگی اطاعت کے طور پر کئے جاتے ہیں کیونکہ سر اونچا رکھنا تکبر' برتری اور بالاتری کے احساس کی علامت سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس سر کو جھکانا' نیچا کرنا' تواضع اور خاکساری انکساری کی علامت ہیں یہ ہمارے خالق ومالک پروردگار کا ہم پر حق ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس طرح کریں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے تمام ارکان کو خوب اچھی طرح اور صحیح طریقے سے ادا کرنے کی سخت ہدایت وتاکید فرمائی ہے۔

(۵)۔ سجدہ۔ نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے کرنا فرض ہیں۔ سجدہ خاکساری' انکساری واطاعت کی انتہائی آخری شکل ہے۔ اس میں انسان اپنی پیشانی اور ناک جو انسانی اعضاء میں سب سے محترم حصے ہیں خاک پر رکھ دیتا ہے۔ اس لحاظ سے رکوع وسجود نماز کے اہم ترین ارکان ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خوب اچھی طرح ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور تاکید فرمائی ہے کہ بہترین کلمات کے ساتھ ان ارکان کی ادائیگی کے وقت خوب اخلاص سے پورے تقدس کے ساتھ تسبیح دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسوال اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' آدمی کی نماز اس وقت تک کافی نہیں ہوتی (یعنی پوری طرح ادا نہیں ہوتی) جب تک وہ رکوع اور سجدہ میں اپنی پیٹھ کو برابر سیدھا نہ کرے۔ (سنن ابی داؤد' جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ' سنن دارمی) ایک اور حدیث مسند احمد میں اس طرح آئی ہے۔

حضرت طلق بن علی حنفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔'' جو بندہ رکوع اور سجدے میں اپنی پشت کو سیدھی برابر نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی نماز کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ (مسند احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجدہ اعتدال کے ساتھ کرو اور کوئی اپنی بانہیں اس طرح نہ بچھائے جس طرح کتا زمین پر بانہیں بچھا دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جب سجدہ کرو تو اپنی ہتھیلیاں زمین پر رکھو اور کہنیاں اوپر اٹھاؤ۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح کھول دیتے۔ (یعنی پہلو سے الگ رکھتے تھے) یہاں تک کہ بغل کی سفیدی نظر آ سکتی تھی۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود دیکھا کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں جاتے تو ہاتھوں سے پہلے اپنے گھٹنے زمین پر رکھتے تھے اور جب سجدے سے اٹھتے تھے تو اس کے برعکس اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے تھے۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''مجھے حکم ملا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے) کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ (یعنی سجدہ اس طرح کروں کہ یہ سات اعضاء زمین پر رکھے ہوں)

(۱) پیشانی (۲) دونوں ہاتھ (۳) اور دونوں گھٹنے (۴) اور ساتھ دونوں پاؤں کے کنارے اور یہ (بھی حکم ہے) کہ ہم اپنے کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

یہ سات اعضاء جن کا حدیث مبارکہ میں ذکر ہے یہ اعضاء سجود کہلاتے ہیں سجدے کی حالت میں انہیں زمین پر ٹکنا چاہئے۔ بعض افراد سجدے میں جاتے ہوئے اپنے کپڑوں کو سمیٹتے ہیں کہ کہیں خاک آلود نہ ہو جائیں۔ زمین وغیرہ سے لگ کر خراب نہ ہو جائیں چونکہ یہ

بات سجدے کی اہمیت اور اس کے مقصد کے مخالف ہے یعنی سجدے کی روح کے منافی ہے اس لیے کپڑے سمیٹنے کو حدیث شریف میں منع کیا گیا ہے۔ رکوع اور سجدے میں کیا پڑھنا اور کیسے پڑھنا چاہئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا احکام اس سلسلے میں ہدایت فرمائے ہیں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت ''فسبح باسم ربک العظیم'' نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس کو اپنے رکوع میں رکھو۔ (یعنی اس حکم کی تعمیل میں سبحان ربی العظیم رکوع میں کہا کرو) پھر جب آیت ''سبح اسم ربک الاعلیٰ'' کا نزول ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو سجدے میں رکھو۔ (یعنی اس کی تعمیل میں سبحان ربی الاعلیٰ سجدے میں کہا کریں) (سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ' سنن دارمی)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپ رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے تھے۔ (سنن نسائی' سنن ابن ماجہ' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد' سنن دارمی)

حضرت عون بن عبداللہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے رکوع میں تین بار سبحان ربی العظیم کہے تو اس کا رکوع مکمل ہو گیا۔ یہ اس کا ادنیٰ درجہ ہوا' اسی طرح جب اپنے سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ تین بار کہے تو اس کا سجدہ پورا ہو گیا اور یہ اس کا ادنیٰ درجہ ہوا۔ (جامع ترمذی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ)

اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ رکوع اور سجدے میں اگر تسبیح تین بار سے کم پڑھی جائے تو رکوع اور سجدہ تو ادا ہو جائے گا لیکن اس کی کامل ادائیگی نہ ہو گی کیونکہ حدیث میں کم از کم تین بار تسبیح کہنے کا حکم دیا گیا ہے ہاں اگر کوئی تین بار سے زیادہ پڑھے تو یہ بہتر ہو گا۔

قومہ یا جلسہ۔ رکوع اور سجدے کے درمیان قومہ کا حکم ہے ایسے ہی ایک رکعت کے دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ یعنی بیٹھنے یا رکنے کا حکم ہے جیسا کہ حدیث سے ہمیں معلوم ہو رہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام (رکوع سے اٹھتے ہوئے) سمع اللہ لمن حمدہ (اللہ نے سنی اس بندے کی جس نے اس کی حمد کی) تو مقتدی لوگوں کو چاہئے کہ وہ کہیں ''اللھم ربنا لک الحمد'' (اے اللہ! ہمارے پروردگار تیرے لیے ہی ساری حمد و ستائش ہے) تو جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے مطابق ہوگا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ میں فرمایا کرتے تھے۔

''رب اغفرلی'' (اے اللہ! میری مغفرت فرما) (سنن نسائی، مسند دارمی)

(۶)۔ قعدہ۔ نماز اگر تین یا چار رکعت والی ہو تو پہلی دو رکعت پڑھنے کے بعد ایک دفعہ درمیان میں بیٹھا جائے گا۔ اس کو قعدہ اولیٰ کہتے ہیں۔ اس قعدہ اولیٰ میں صرف تشہد یعنی التحیات پڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر اگر نماز تین رکعت کی ہے تو تیسری رکعت میں اور چار رکعت کی ہے تو چوتھی رکعت پڑھنے کے بعد دوبارہ بیٹھ جاتے ہیں اور تشہد کے بعد درود شریف پڑھتے ہیں اس کے بعد دعاء قنوت یا جو دعا یاد ہو یا جو دعا اچھی معلوم ہو وہ پڑھے۔ قعدے میں بیٹھنے کا طریقہ بھی رسول کریمؐ نے تعلیم فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے والد (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو دیکھتے تھے کہ وہ نماز میں چہار زانو بیٹھے تھے۔ میں بھی اسی طرح چہار زانو بیٹھنے لگا حالانکہ میں اس وقت بالکل نو عمر تھا۔ والد ماجد نے مجھے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا اور مجھے بتایا کہ نماز میں بیٹھنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ اپنا داہنا پاؤں کھڑا کرو اور

بایاں پاؤں موڑ کر بچھاؤ۔ میں نے عرض کیا۔ خود آپ جو چہار زانو بیٹھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ (میں مجبوری اور معذوری کی وجہ سے اس طرح بیٹھتا ہوں) میرے پاؤں اب میرا بوجھ نہیں سہارتے۔ (صحیح بخاری)

قعدہ اولیٰ میں اختصار اور جلدی کرنا چاہئے۔ ذیل کی حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قعدہ اولیٰ میں صرف تشہد پڑھ کر فوراً ہی کھڑے ہو جانا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی دو رکعتوں میں بیٹھتے تھے (یعنی قعدہ اولیٰ فرماتے) تو اتنی جلد فرماتے جیسے گرم تپتے پتھروں پر بیٹھے ہوں، یہاں تک کہ تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسوال اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگوٹھے کے برابر والی انگلی (شہادت کی انگلی) کو اٹھا کر اس سے اشارہ فرماتے تھے اور اس وقت بایاں ہاتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بائیں گھٹنے پر ہی دراز ہوتا۔ (اس سے کوئی اشارہ نہ کرتے) (صحیح مسلم)

اس حدیث شریف سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ قعدہ میں کلمہ شہادت کے وقت شہادت کی انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا چاہئے۔ اس کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت نمازی التحیات میں اشھد ان لا الہ الا اللہ کہہ تو وہ اللہ تعالیٰ کے واحد لاشریک ہونے کی شہادت دے رہا ہوتا ہے اس کا دل توحید کے تصور اور یقین سے لبریز ہوتا ہے اور داہنے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی سے اشارہ اس کے جسم کی شہادت ہوگی۔ اس اشارے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

انگشت شہادت کا یہ اشارہ شیطان کے لیے لوہے کی تیز دھار دار چھری اور تلوار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ (مشکوۃ۔ مسند احمد)

(۷)۔ نماز کی تکمیل پر سلام پھیرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح نماز کے آغاز کے لیے اللہ اکبر کا کلمہ تعلیم فرمایا ہے اسی طرح نماز کی تکمیل یا اختتام کے لیے بھی ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی تلقین فرمائی ہے۔ یقیناً نماز کے خاتمے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بات ہم بہ خوبی جانتے ہیں کہ سلام اس وقت کیا جاتا ہے جب ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد پھر ملاقات ہوتی ہے یہاں اختتام نماز کے لیے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی تعلیم دے کر مسلمانوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ نمازی بندے نے تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر خود کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور پیش کر دیا اور اپنی عرض ومعروضات کا اظہار کر رہا ہے' یہ موقع ہوتا ہے جب بندہ اپنے اردگرد' آگے پیچھے سے بے گانہ اور الگ تھلگ ہو کر صرف اپنے رب کے حضور حاضر ہو اور اس کے دل و دماغ میں صرف اللہ کے حضور حاضری کا احساس وخیال ہو' پورے اخلاص اور توجہ سے نماز میں مشغول ہو پھر جب قعدہ آخر میں تشہید درود اور آخری دعا اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کر کے اپنی نماز پوری کر لے تو اب اس کے باطن کا حال یہ ہوگا جیسے وہ اب کسی دوسرے عالم سے واپس دنیا میں اپنے ماحول میں واپس آیا ہو اور اپنے دائیں بائیں والے افراد اور فرشتوں سے اب اس کی دوبارہ ملاقات ہو رہی ہو۔ اس لیے اب وہ ان کی طرف رخ کر کے اور ان ہی سے مخاطب ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر اپنی نماز پوری کرتا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسوال اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طہارت (یعنی وضو) نماز کی کنجی ہے اور اس کی تحریمہ اللہ اکبر کہنا ہے اور اس کی بندش کھولنے کا ذریعہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا ہے۔ (سنن ابی داؤد' جامع ترمذی۔ مسند دارمی' سنن ابن ماجہ)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے وقت داہنی جانب اور بائیں جانب رخ فرماتے تھے اور چہرہ مبارک کو داہنی جانب اور بائیں جانب اتنا پھیرتے تھے کہ ہم رخسار مبارک کی سفیدی دیکھ لیتے تھے۔ (صحیح مسلم)

ایمان کے بعد پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا ہے اس لیے ضروری تھا کہ نماز کے بارے میں تفصیل سے بات کی جائے۔ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز کو جتنی اہمیت دی گئی ہے اور کسی عبادت کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ نماز اپنی عظمت وشان میں تمام عبادات میں افضل اور خاص امتیاز کی حامل ہے۔ نماز میں اطاعت و بندگی اور تزکیہ نفس کی نہ صرف تربیت دی گئی ہے بلکہ بندگی کے تمام آداب بھی نماز میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کو دین کا عظیم ترین شعار اور امتیاز قرار دیا گیا ہے اللہ ہمیں دین پر استقامت عطا فرمائے اور نماز کا پابند کرے۔

اس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے ارکان و شرائط میں مختلف مسالک میں کیا فرق ہے پر ایک نظر ڈالیں تا کہ دیگر مسالک اور حنفی مسلک کی نماز کے فرق کو سمجھا جا سکے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ نماز کی شرائط سات ہیں۔

(۱) بدن کا پاک ہونا۔ یہ شرط تمام مسالک میں مشترک ہے۔

(۲) لباس کا پاک ہونا۔ یہ شرط تمام مسالک میں مشترک ہے۔

(۳) نماز کی جگہ کا پاک ہونا۔ یہ شرط تمام مسالک میں مشترک ہے۔

(۴) ستر چھپانا یہ شرط بھی تمام مسالک میں مشترک ہے۔

(۵) نماز کا وقت ہونا یہ شرط بھی تمام مسالک میں مشترک ہے لیکن فقہ جعفریہ میں فجر کے بعد ظہر اور عصر کو ایک وقت ظہرین میں ادا کرتے ہیں ایسے ہی مغرب اور

عشاء کو مغربین ایک وقت میں ادا کرتے ہیں لیکن کچھ پانچوں نمازوں کو ان کے وقت پر بھی ادا کرتے ہیں۔

(۶) قبلہ رخ ہونا — یہ شرط بھی سب میں مشترک ہے۔

(۷) نیت کرنا — یہ شرط بھی سب میں مشترک ہے۔

ارکان نماز بھی سات ہیں۔

(۱) تکبیر تحریمہ — اس پر تمام مسالک کا اتفاق ہے۔

(۲) قیام — اس پر تمام مسالک کا اتفاق ہے۔

(۳) قرأت — اس پر بھی تمام مسالک کا اتفاق ہے لیکن امام کے پیچھے قرأت کرنے میں اختلاف ہے۔ حنفی مسالک کے سوا تمام دیگر مسالک میں امام کے پیچھے بھی مقتدی قرأت کرتے ہیں۔

(۴) رکوع — اس پر کوئی اختلاف نہیں سب متفق ہیں۔

(۵) سجدہ — اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں۔

(۶) قعدہ آخر — اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں

(۷) اختیاری فعل سے نماز ختم کرنا فقہ جعفریہ کے علاوہ دیگر مسالک میں نماز کا اختتام یا تکمیل دائیں بائیں سلام پھیر کر کیا جاتا ہے جبکہ فقہ جعفریہ میں تشہید و سلام پڑھ کر نماز ختم کی جاتی ہے۔ واجباتِ نماز میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ تمام مسالک میں تقریباً یکساں ہیں۔

اے اللہ میں تیری حمد وستائش کے ساتھ تیری پاکی بیان کرتا ہوں، تیرا پاک نام بڑا مبارک ہے۔ تو بڑی عظمت والا ہے۔ تیرے سوا کوئی بھی عبادت اور بندگی کا مستحق نہیں، اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے اور میری نسل کو بھی اس کی توفیق دے۔ اے میرے رب میری دعا قبول فرمالے اور اپنے ایمان والے تمام بندوں کو بخش دے۔ (آمین)

زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم ترین رکن ہے۔ قرآن کریم میں ستر سے زیادہ مقامات پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ دونوں لازم وملزوم معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اسلام میں دونوں عبادات یعنی نماز اور زکوٰۃ کا درجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ زکوٰۃ میں نیکی اور افادیت کے تین پہلو ہیں۔ نماز میں بندہ مومن جس طرح قیام رکوع وسجود کے ذریعے رب کائنات کے حضور اپنی بندگی واطاعت ونیاز مندی کمتری کا مظاہرہ عملاً جسم وجاں سے اور زبان سے کرتا ہے کہ اللہ کی رضا حاصل ہو سکے اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کر کے وہ اپنے رب مالک وآقا کے حضور اپنی مالی نذر گزارتا ہے اور اس بات کا عملی ثبوت دیتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہی دیا ہوا اور سب کچھ اسی کا ہے۔ جسے اس کے حکم کے مطابق ہی خرچ کرنا ہے اور وہ اس طرح اپنی بندگی واطاعت کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے رحم وکرم اور فضل سے نوازے۔

دوسرا پہلو زکوٰۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ رکھا ہے کہ اللہ کے جو بندے پریشان حال اور ضرورت مند ہوں اس کے ذریعے ان کی مدد واعانت ہو سکے اور مسلم معاشرے میں مفلسی مفلوک الحالی کو ختم کیا جا سکے۔ اسلامی نظام زندگی اور معاشرے کی اخلاقیات کا یہ نہایت اہم پہلو بھی ہے اور معاشی استحکام کا ذریعہ بھی ہے۔

تیسرا پہلو زکوٰۃ کی ادائیگی کا یہ ہے کہ انسان میں دولت کی ہوس اور محبت جو انسانوں کے لیے ایک مہلک اور متعدی بیماری کی مانند ہے پیدا نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے باعث اللہ اپنے بندوں کے نفس کی تطہیر اور تزکیہ فرماتا ہے جیسا کہ سورۃ توبہ میں فرمایا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

ترجمہ:۔آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لے لیجئے جس کے ذریعے آپ ان کو پاک صاف کردیں۔(سورۃ توبہ۔۱۰۳)

آیت مبارکہ میں حکم عام دیا جارہا ہے۔صدقے سے مراد فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ ہے اور نفلی صدقہ بھی ہوسکتا ہے اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ رہا ہے اس کے ذریعے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کی تطہیر اوران کا تزکیہ فرمادیں۔اس سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے انسان کے اخلاق وکردار کی پاکیزگی وطہارت کا اہتمام رب کائنات فرمارہا ہے۔صدقے کو صدقہ اس لیے کہا جاتا ہے مال خرچ کرنے والا اپنے دعویٰ ایمان میں کتنا صادق ہے اس سے اسلامی معاشرے میں اخوت و بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے باہمی قربتیں بڑھتی ہیں۔

زکوٰۃ کے متعلق سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک عبادت ہے کسی قسم کا ٹیکس یا انکم ٹیکس نہیں ہے۔اسلام کا اہم ترین رکن ہے جس طرح نماز' روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں۔زکوٰۃ کا نفاذ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر زمانے میں تمام انبیاء کرام کے دین میں نافذ فرمایا ہے یہ قطعی کسی قسم کا ٹیکس نہیں ہے کیونکہ حکومت وقت کے تمام ٹیکسوں میں ایسا کوئی ٹیکس نہیں ہے۔زکوٰۃ کو اللہ تعالیٰ نے تمام صاحب نصاب مسلمانوں پر فرض فرمایا ہے اور اس کی تقسیم کا نظام بھی تعلیم فرمایا ہے۔زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت تو یہی ہے کہ اپنی دولت وکمائی میں سے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا جائے۔اسلام کے ابتدائی دور میں یہی حکم تھا پھر بعد میں تفصیلی حکم آیا اور اس کے ضوابط مقرر ہوئے۔یعنی مال کی کن اقسام پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کم از کم کتنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کتنی مدت گزرجانے پر ہوگی اور زکوٰۃ کن کن راہوں پر خرچ ہوسکے گی۔ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑوں میں اور غلاموں میں زکوٰۃ واجب نہیں کی گئی۔

پس ادا کرو زکوٰۃ چاندی کی ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم اور ایک سو نناوے درہم تک کچھ واجب نہیں اور جب پورے دو سو ہو جائیں تو ان میں پانچ درہم واجب ہوں گے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جس کسی کو کسی راہ سے مال حاصل ہو تو اس پر اس کی زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں ہوگی جب تک اس مال پر پورا سال نہ گزر جائے۔ (جامع ترمذی)

زکوٰۃ ایسے مال کو کہتے ہیں جو شرائط مخصوصہ کے ساتھ کسی مستحق آدمی کو اپنے مال کے ایک معین حصے کا مالک بنا دینا۔ امام راغب اصفہانی کے قول کے مطابق مال کا وہ حصہ جو حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقرا کو دیا جاتا ہے زکوٰۃ صدقہ مفروضہ اور ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسے زکوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے۔ اس سے نفس انسانی پاکیزہ ہوتا ہے، زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے ایک پاکیزگی دوسرا نشوونما، کسی چیز کی ترقی میں جو چیز مانع ہو اس کو دور کرنا اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا۔ یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا تصور پورا کرتے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس کا اطلاق دو معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو تزکیہ کے مقصد سے نکالا جائے دوسرے زکوٰۃ خود تزکیہ کا فعل ہے۔

زکوٰۃ چار اقسام کے اموال پر فرض ہے۔ (۱) ایسے جانوروں پر جو سارا سال گھر سے باہر چرتے ہوں اور گھر میں نہ کھاتے ہوں۔ (۲) سونے چاندی پر (۳) کھیتی اور درختوں کی

پیداوار پر (۴) ہر قسم کے تجارتی مال پر۔ ہر ایک کا نصاب مال اپنا اپنا ہے۔ نصاب مال کی وہ خاص مقدار ہے جس پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے۔ چاندی سونے اور تمام تجارتی مال پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے اور سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے سونا ہے زکوٰۃ اس کی موجودہ قیمت کے اعتبار سے نکلے گی۔ مال کی قیمت اگر ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت یا ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو تو مال پر سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو مال کی قیمت کا چالیسواں حصہ ہوگی۔

زیورات پر زکوٰۃ کے حکم کے بارے میں حدیث مبارکہ:۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔ ''تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' اس نے کہا میں تو اس کی زکوٰۃ نہیں دیتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تو کیا تمہارے لیے یہ بات خوشی کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کنگنوں کی (زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے) قیامت کے دن آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ سنتے ہی اس عورت نے دونوں کنگن اتار کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیئے اور عرض کیا اب یہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ہیں۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ اس لیے ہی سونے چاندی کے زیورات پر (اگر وہ نصاب کے قابل ہوں) زکوٰۃ فرض ہونے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے آئمہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ صرف اس صورت میں فرض ہے جب وہ تجارت کے لیے ہوں یا مال کو محفوظ رکھنے کے لیے بنوائے گئے ہوں۔ لیکن جو زیورات استعمال اور آرائش کے لیے ہوں ان آئمہ کے نزدیک ان پر زکوٰۃ

واجب نہیں ہے جبکہ احادیث سے بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ زکوٰۃ وصدقات کے مستحقین کے بارے میں رب کائنات قرآن حکیم میں فرما رہا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

ترجمہ:۔ زکوٰۃ بس حق ہے مفلسوں اور محتاجوں کا اور اس کی تحصیل وصولی کا کام کرنے والوں کا اور مولفتہ القلوب کا نیز وہ صرف کی جا سکتی ہے غلاموں کو آزادی دلانے اور ان کی گلوخلاصی کرانے میں اور ان لوگوں کی مدد میں جو قرض وغیرہ کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اور (اسی طرح) مجاہدوں اور مسافروں کی مدد میں۔ (التوبہ۔۶۰)

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف بیان فرمائے گئے ہیں۔

(۱)۔فقرا:۔ لفظ فقیر عربی زبان میں غنی یعنی مال دار کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ شخص جو اپنی معیشت کے لیے دوسروں کے محتاج ہوں۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کا محتاج ہو۔ یتیم بچے' بیوہ عورتیں' بے روزگار افراد اور ایسے تمام افراد جو کسی وقتی حادثے کے باعث مفلس ہو گئے ہوں اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔

(۲)۔مساکین:۔ وہ تمام حاجت مند جن کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کچھ نہ ہو خالی ہاتھ ہوں۔ مسکین کے لفظ میں عاجزی' درماندگی' بے چارگی اور ذلت کے مفاہیم سب آ جاتے ہیں اس اعتبار سے مسکین وہ لوگ ہوں گے جو عام حاجت مندوں کی نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکین کی تشریح فرماتے ہوئے

خصوصیت سے ایسے افراد کو مستحق امداد ٹھہرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں مگر وہ خودداری کے باعث کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ہمت نہیں رکھتے ہوں اور ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ان کی طرف توجہ دے۔

(۳)۔ عاملین:۔ زکوٰۃ وصول کرنے اور اس کی حفاظت کرنے والا عملہ۔ ایسے لوگ اگر فقراو مسکین نہ بھی ہوں بلکہ غنی ہوں تب بھی ان کی تنخواہ زکوٰۃ سے ادا کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ ہی کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر فرما دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے لیکن معاوضہ لے کر بنی ہاشم کے افراد کے لیے اس شعبے میں خدمت کرنا جائز نہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے افراد صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔

(۴)۔ مولفتہ القلوب:۔ ایسے افراد جن کی تالیف قلب اور دل جوئی اور اہم دینی وملی مصالح کے لیے ضروری ہو اگر وہ دولت مند ہوں تب بھی اس مقصد کے لیے زکوٰۃ ان پر خرچ کی جاسکتی ہے۔ ابتدائے اسلام کے وقت جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم عمل تھے یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر ان کی مالی مدد نہ کی گئی تو کہیں وہ اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں تو ان کے مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد میں دیگر ذریعۂ آمدن کے علاوہ زکوٰۃ کی مد سے بھی

ایسے لوگوں کی مدد کی گئی ایسے لوگوں کے لیے مسکین و فقیر ہونا یا مسافر ہونا شرط نہیں مال دار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے یہ مد ختم ہوگئی تھی۔ اس لیے اب مولفۃ القلوب کی مد میں کچھ دینا جائز نہیں جبکہ حضرت امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے اب بھی زکوٰۃ کی مد سے دیا جاسکتا ہے۔ مگر کفار کو نہیں۔ دیگر فقہا کے نزدیک اس مد میں اب بھی ایسے افراد کی مدد زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے۔

امام شافعیؒ کا استدلال یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تالیف قلب کے لیے کفار کو مال زکوٰۃ دینا ثابت نہیں ہے بلکہ جتنے بھی ایسے واقعات حدیث میں ملتے ہیں ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو تالیف قلب کے لیے جو کچھ دیا مال غنیمت سے دیا زکوٰۃ سے نہیں۔

(۵) رقاب:۔ گردنیں چھڑانے سے مراد ہے کہ غلاموں کی آزادی میں مال زکوٰۃ صرف کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کر رکھا ہو کہ میں اگر اتنی یعنی مقررہ رقم تمہیں ادا کردوں تو تم مجھے آزاد کردو گے تو ایسے غلام کی آزادی کی قیمت ادا کرنے میں زکوٰۃ سے مدد کی جاسکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے خود غلام خرید کر آزاد کیا جائے۔

(۶)۔ غارمین:۔ جن لوگوں پر ایسا مالی بار آپڑا ہو جس کے اٹھانے کی ان میں طاقت نہ ہو یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنا پورا قرض چکادیں تو ان کے پاس نصاب سے بھی کم مال بچ سکتا ہو ایسے لوگ خواہ برسر روزگار ہوں یا بے روزگار یعنی عرف عام میں غریب یا امیر سمجھے جاتے ہوں دونوں ہی صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے۔

(۷)۔ فی سبیل اللہ:۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اس سے مراد جہاد فی سبیل ہے۔

(۸) ابن السبیل:۔ اس سے مراد ایسے مسافر ہیں جنہیں سفر میں کسی بھی وجہ سے مدد کی ضرورت ہو۔ مسافر اپنے گھر میں خواہ کتنا ہی امیر کبیر ہو لیکن حالت سفر میں اگر وہ کسی بھی طرح سے مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوۃ سے کی جا سکتی ہے۔ دین اسلام کی اصولی تعلیمات سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص بھی مدد کا محتاج ہو اس کی دست گیری کرنا مصیبت کے وقت ان کو سہارا دینا اور حسن سلوک کرنا ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کرنا۔

زکوۃ پیشگی ادا کی جا سکتی ہے۔ ایک حدیث شریف حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی زکوۃ پیشگی ادا کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (سنن ابی داؤد۔ جامع ترمذی۔ سنن ابن ماجہ۔ سنن دارمی)

پیشہ ور گداگر زکوۃ کے مستحق نہیں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم میں حدیث روایت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اصلی مسکین (جس کی صدقے سے مدد کی جا سکے) وہ آدمی نہیں جو (مانگنے کے لیے) لوگوں کے پاس آتا جاتا ہے۔ (در در پھر کر سوال کرتا ہے) اور ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں (جب اسے مل جاتی ہیں) لے کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ بلکہ اصل مسکین وہ بندہ ہے جس کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا سامان بھی نہیں ہے اور (جو شرم و حیا کے باعث اپنا حال لوگوں سے چھپاتا ہے اور سوال نہیں کرتا اپنی ضرورتوں کا اظہار نہیں کرتا) کسی کو اس کی حاجت مندی

کا احساس بھی نہیں ہوتا' کہ صدقے سے اس کی مدد کی جائے اور وہ نہ چل پھر کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ (بخاری' مسلم)

حدیث مبارک سے زکوٰۃ کے اصل حق دار مستحقین کے بارے میں ہدایت مل رہی ہے کہ زکوٰۃ کو بہت احتیاط کے ساتھ پوری طرح باخبر اور باعلم ہو کر اصل مستحقین تک پہنچانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی نادانی اور جلد بازی میں اپنی زکوٰۃ کو ہی ضائع کر دیں ایسے ضرورت مندوں کو تلاش کر کے زکوٰۃ دینی چاہیے جو اپنی ضروریات کے لیے بھی اپنی فطری شرم و حیا اور عفت نفس کی وجہ سے لوگوں پر اپنی حاجت مندی اور اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی سے کسی طرح سے سوال کرتے ہیں۔ دراصل حدیث کی رو سے ایسے ہی لوگ زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں اور اصل مسکین بھی۔ جن کی خدمت اور مدد کو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے محبوب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے ہیں۔

زکوٰۃ کا اصل مقصد بنی نوع انسانی کی ہمدردی واعانت ہے اس لیے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیئے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کے مستحق ہیں یعنی فقرا' مساکین' عمال زکوٰۃ' مولفتہ القلوب' مقروض' مسافر' غازی' مکاتب' چونکہ ان لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں حکم موجود ہے اس لیے ان پر تمام مجتہدین کا اتفاق ہے۔ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ ان اقسام سے باہر نہیں جانی چاہیے لیکن وقت کے تقاضہ اور ضرورت پڑنے پر یا حاکم وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے منتخب کر سکتا ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک ان آٹھ اقسام کے اشخاص کو ہی زکوٰۃ لازمی ادا کی جائے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اور زکوٰۃ کا فرض ادا ہی نہیں ہوگا۔

ایک اور مسئلہ حضرت امام ابوحنیفہؒ او دیگر آئمہ کے درمیان اختلافی ہے کہ چوپاؤں (بھیڑ بکری' اونٹ' گائے' بھینس) وغیرہ پر زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ کیا ہو۔ حضرت

امام ابوحنیفہؒ کے مطابق جانور یا اس کی قیمت ادا کی جاسکتی ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک قیمت ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی' جانور کی زکوٰۃ جانور سے ہی ادا ہوسکتی ہے جبکہ دیگر آئمہ کی نسبت امام اعظم کا مسلک درست ہے چونکہ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک دیگر آئمہ کی نسبت آسان اور تیز تر عمل والا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہ قول مبارک ہے کہ میں نرم اور آسان شریعت لے کر آیا ہوں۔ یقیناً اسلام آسان تر مذہب ہے۔

فقہ جعفریہ کے مطابق زکوٰۃ کا نصاب وہی ہے یعنی چالیسواں حصہ لیکن اس فقہ میں یہ لازمی ہے کہ شیعہ کی زکوٰۃ صرف شیعہ ہی کو دی جاسکتی ہے۔ غیر شیعہ کو دینے سے زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوگی اگر کسی کو شیعہ سمجھتے ہوئے زکوٰۃ دے دی جائے اور بعد میں معلوم ہو کہ زکوٰۃ لینے والا شیعہ نہیں تھا تو دینے والے کی زکوٰۃ ادا ہی نہیں ہوگی اور سید کسی غیر سید سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا لیکن بہ حالت مجبوری لے سکتا ہے۔ فقہ جعفریہ میں زکوٰۃ کے علاوہ خمس بھی نکالا جاتا ہے۔ یہ تمام مال کا پانچواں حصہ ہوتا ہے جو فقہاء دینی مدارس اور مجتہد کو دیا جاتا ہے اس میں آدھا حصہ کسی شیعہ یتیم یا شیعہ فقیر کو دیا جاتا ہے۔ خمس کے دو حصے ہوتے ہیں (توضیح المسائل آقا۔ سیستانی)

قیاس

قرآن وحدیث کی موجودگی میں آخر قیاس کی کیوں ضرورت پڑی اور کس بنیاد پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب فتوحات اسلامی کو نہایت وسعت ملی اور دور دراز ممالک تک مملکت اسلامی کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اسلامی تمدن پھیلتا چلا گیا تو نئے نئے مسائل پیش آنے لگے جن کے متعلق نہ تو قرآن کریم میں اور نہ ہی سنت رسول کریم میں کوئی حکم موجود تھا اور نہ ہی ان کے بارے میں اجماع امت تھا تو ہی فقہا و امت کو اجتہاد واستنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اور قیاس ورائے کو کام میں لانے پر مجبور ہوئے لیکن قیاس یا رائے کے بارے میں فقہاء بالکل آزاد نہیں تھے بلکہ وہ قواعد وضوابط کے پابند تھے۔ یہیں سے اسلامی قوانین کی چوتھی دلیل قائم ہوئی۔

خلافت راشدہ کے بعد جب شاہی طرز حکومت قائم ہوئی تو اسلامی نظام قانون میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا جو تقریباً ایک صدی کے قریب رہا۔ خلافت راشدہ میں ''شوریٰ'' وہی کام کرتی تھی جو آج کی موجودہ اسمبلیاں یا قانون ساز ادارے کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں جو مسائل پیش آئے اور جن میں واضح قانونی حکم کی ضرورت ہوئی تو خلیفہ کی مجلس شوریٰ ان پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اجتماعی فکر سے کام لے کر اجتہاد کر کے فیصلہ کرتی تھی بعد میں وہی فیصلے پوری مملکت اسلامی میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو جاتے تھے۔

اگر قرآن حکیم کے کسی فرمان کی تعبیر میں یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق میں یا کسی نئے مسئلے پر اصول شریعت کی تطبیق میں کوئی اختلاف ہوتا تو وہ مجلس شوریٰ کے سامنے ہر

وقت پیش ہو سکتا تھا اس پر اجماع یا کثرت رائے سے فیصلہ ہو جاتا تھا اور وہ قانون بن جاتا تھا۔ خلافت راشدہ کی مجلس شوریٰ کی حیثیت نہ تو کسی سیاسی طاقت کے باعث اور نہ ہی حکومتی طاقت کے باعث مستحکم اہمیت کی حامل تھی اس پر اعتماد و یقین کی وجہ خلیفہ وقت کی اپنی شخصیت کی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی اور خوفِ الٰہی اور اہل مجلس شوریٰ کی دیانت، اخلاص، علم وحلم اور دین پر ان کی استقامت کے باعث تھی۔ خلفائے راشدین کا یہ طرزِ عمل تھا کہ وہ جو کچھ کرتے اس میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیتے تھے اور قرآن نے جو حدود مقرر کی ہیں اس کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں جو قانون حکمران ہونا چاہئے وہ صرف اللہ کا قانون ہے۔

جب مسلمانوں میں حکمرانی وحکومت خلافت سے تبدیل ہو کر شاہی حکومتوں میں تبدیل ہوگئی تب بھی گو کہ حکمران اور اعیان حکومت اور اہل دربار حکومت سب کے سب مسلمان ہی ہوتے تھے لیکن ان میں سے کوئی شاہی احکام کی درستگی اور مخالفت کی جرات نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی شاہی حکمران خلافتِ راشدہ کی مانند فیصلے دیتے تھے کیونکہ وہ اس بات سے بہ خوبی آگاہ تھے کہ اگر انہوں نے خلافتِ راشدہ کی طرح کوئی مجلس شوریٰ بنادی تو ان کی حکمرانی تادیر نہیں چل سکے گی اور اگر وہ واقعی خلفائے راشدین کی طرح کی مجلس شوریٰ بناتے تو پھر ان کے شاہی فیصلے نہ چل سکتے اور اگر وہ کوئی اپنی مرضی کی مجلس شوریٰ بناتے تو مسلمان اس کے فیصلے تسلیم ہی نہ کرتے یا انہیں شرعی فیصلے نہ مانتے اسی صورت حال کے باعث اسلامی نظام قانون میں از خود ایک خلا پیدا ہوتا چلا گیا کیونکہ خلافت راشدہ کے بعد پیش آنے والے مسائل معاملات کے حل کے لیے کوئی ادارہ موجود نہیں تھا جو قرآن کی تعبیر اور سنت کی تحقیق اور قوت اجتہاد کے استعمال سے فیصلے کرتا جو اسلامی مملکت کا قانون قرار پاتا اس دور میں جو علما ومفتیان کرام اپنی ذاتی حیثیت میں درپیش مسائل کے بارے میں فتوے دیتے رہے وہ ملکی

قانون نہیں بن سکے۔

تقریباً ایک صدی اسی حالت میں گزری جسے محسوس کرتے ہوئے امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے بغیر کسی سیاسی قوت اور آئینی حیثیت کے صرف اپنے شاگردوں کی مدد سے ایک غیر سرکاری مجلس شوریٰ یا مجلس قانون ساز تشکیل دی جو قرآن مجید کے احکام کی تعبیر کرتی۔ سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق سلف صالحین کے اجماعی فیصلوں کو تلاش وجستجو کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' تابعین اور تبع تابعینؒ کے فتاویٰ کی جانچ پڑتال اور معاملات ومسائل پر اصول شریعت کی تطبیق کرتی گوکہ یہ کام بڑا مشکل اور تحقیق طلب تھا لیکن تقریباً پچیس تیس سالوں کی محنت سے اسلام کا پورا قانون مدون کر دیا گیا۔ یہ کام کسی بادشاہ یا سلطان کی رضامندی یا خواہش پر نہیں کیا گیا تھا کوئی حکومتی طاقت اس کی پشت پر نہیں تھی لیکن اس کام اور قانون کی اہمیت کے باعث سلطنت عباسیہ کا قانون بن گیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ ان کے معتبر ومحترم شاگردوں نے شب وروز کی محنت سے اسے سرانجام دیا تھا جن پر مسلمانوں کی اکثریت اعتماد کرتی تھی۔ اس لیے عام مسلمانوں نے آپ سے آپ ان قوانین کی پیروی شروع کر دی تب مجبوراً سلطنت عباسی کو بھی انہیں اپنانا پڑا۔

قیاس کی دلیل شرعی قرار دینے میں فقہاء نے قاعدہ شرعی کے اس اصول سے استدلال کیا ہے کہ شریعت کے تمام احکام مخصوص اغراض ومصالح پر مبنی ہیں اور اغراض ومصالح ہی ان احکام کی علت غائی اور ان کے وجود کا سبب ہیں۔

قیاس کے بارے میں مختصراً یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جن مسائل کے متعلق قرآن وسنت میں یا تو سرے سے کوئی حکم موجود نہ ہو یا حتمی یا صریح حکم نہ ہو تو ایسے مسائل میں تغیرات زمانہ اور فقہائے مجتہدین کی آراء کے زیر اثر اجماع اسلامی قانون سازی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اسلامی علوم' تفسیر' حدیث' مغازی کی ابتدا گوکہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہو چکی تھی لیکن

ان کو فن کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ فن کسی خاص شخصیت کی طرف منسوب ہو سکا تھا۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں تدوین وترغیب شروع ہوئی جن جن لوگوں نے تدوین وترتیب کی وہ ان علوم کے بانی کہلائے چنانچہ فقہ کے بانی کا لقب امام اعظم ابوحنیفہؒ کو ملا درحقیقت وہ اس لقب کے پوری طرح سزاوار بھی تھے۔ امام ابوحنیفہؒ سے پہلے فقہ نہ تو کوئی مستقل فن تھا اور نہ مرتب فن کے طور پر کسی نے مرتب کیا تھا جب امام اعظمؒ نے اس فن کی تدوین کی تو ہزاروں مسائل ایسے پیش آئے جن کے بارے میں کوئی حدیث صحیح یا صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کا کوئی قول موجود نہیں تھا جس سے مدد لے کر درپیش مسائل کو حل کیا جا سکتا۔ اسلامی تہذیب وتمدن کی وسعت کے ساتھ ساتھ کثرت سے ایسے واقعات پیش آنے لگے جن میں قیاس کی ضرورت پیش آنے لگی۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے فقہ کو مستقل فن بنایا اور اس کے اصول وقواعد مرتب کیے اس لیے ہی انہیں امام اہل الرائے بھی کہا گیا۔ امام اعظمؒ نے قیاس یا رائے کو دلیل کے طور پر اپنانے اور فیصلہ کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کو اپنایا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل ابوموسیٰ اشعری رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قاضی مقرر فرمایا یمن کے لیے تو ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ''تم کس کی رو سے فیصلہ کرو گے؟'' تو انہوں نے جواب دیا 'قرآن کی رو سے فیصلہ کروں گا۔

پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ ''اگر قرآن میں وہ حکم نہ پاؤ تو؟'' انہوں نے جواب دیا ''تو اس وقت میں سنت کی رو سے فیصلہ کروں گا۔''

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ ''اگر سنت میں بھی وہ حکم نہ پاؤ تو؟'' اس پر انہوں نے جواب دیا کہ اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔'' ان کے اس

جواب پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔ (مسند احمد' مسند ابی داؤد' جامع ترمذی)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قیاس پر حکم فرمایا ہے مثلاً۔

ایک عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ ''یارسول اللہ میری ماں نے حج کی منت مانی تھی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہاں اس کی طرف سے حج کر۔ ذرا یہ بھی سوچ کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا نہ کرتی؟ پس تو اللہ کا قرض بھی ادا کر کیونکہ اللہ کے قرضے کی ادائیگی سب سے مقدم ہے۔''

اس حدیث مبارکہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضہ حج کو قرض کی ادائیگی کے فرض پر قیاس فرمایا۔ قیاس کرنے میں تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی متفق تھے اس کا ثبوت وہ فقرہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمایا تھا۔

''امثال و نظائر کو پہچانو اور سمجھو پھر زیر فتوئی مسائل کو ان پر قیاس کرو۔''

اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ آپؓ نے ایک شرابی کی سزا سے متعلق صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''شرابی کو تہمت لگانے والے کی سزا دیجئے۔ یعنی اسی کوڑے۔ کیونکہ جب اس نے شراب پی تو اس کو نشہ ہوا اور جب نشہ ہوا تو بیہودہ بکا۔ اور جب بیہودہ بکا تو تہمت لگائی۔'' اس مثال میں شراب پینے کو تہمت لگانے سے قیاس کیا گیا ہے۔ (موطا امام مالک)

قیاس کے اصول' ارکان و شرائط:۔ وہ قیاس جو واقعی اسباب کے لحاظ سے کیا جائے اور شرعی اصول و ضوابط کے مطابق ہو اور قیاس قرآن اور حدیث کے مطابق ہو وہ قیاسی فیصلے جو

اصول شرح کے مطابق کئے جائیں وہ کسی بھی حالت میں قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوں گے۔ قیاس کے چار ارکان ہیں۔

(۱)۔اصل مقیس علیہ یعنی جس پر قیاس کیا جائے۔

(۲)۔فرع مقیس یعنی جس چیز کو قیاس کیا جائے۔

(۳)۔حکم۔ جو حکم قیاس کے بعد لگایا جائے۔

(۴)۔علت۔ یعنی وہ وصف جو مقیس علیہ اور مقیس میں مشترک ہو اور قیاس کا سبب ہو جیسا کہ شرابی کی مثال ہے اس میں شراب اصل ہے نشہ آور یعنی نبیذ فرع ہے' نشہ علت مشترکہ ہے اور حرام ہونے کا حکم شرعی ہے۔ قیاس اس وقت تک صحیح شمار نہیں ہوگا اور نہ ہی دلیل شرعی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب تک اس میں تمام مقررہ شرائط موجود نہ ہوں۔

نص یعنی قرآن کے واضح احکام یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعی احکام اگر موجود ہوں تو اس پر کسی بھی مسلک وفرقہ اسلامی کو اختلاف نہیں ہے کہ ایسی صورت میں قیاس یارائے کی طرف رجوع کیا جائے۔ ہاں اگر قرآن وسنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو ہی رائے کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے اور رائے بھی وہ رائے مقدم ہوگی جو کسی زمانے کے علماء مجتہدین کی متفقہ ہو' یعنی اجماع اس کے بعد اس رائے کا درجہ ہے جو تمام شرائط وضوابط کے ساتھ قیاس کی گئی ہو۔

اسلام میں قانون سازی کی بنیاد حقیقی عدل وانصاف پر قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ قانون الٰہی ہے۔ اس میں دین واخلاق معاشرت اور اقتصادی تمام ضابطے موجود ہیں اور تمام کے تمام قدرتی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ومنسلک ہیں۔ ان میں بڑی ہم آہنگی موجود ہے۔ احکامِ الٰہی کے تمام اصول ودلائل' تعلیمات میں یکسانیت اور ایسی ہم آہنگی ہے جو انسانی دل ودماغ پر نقش ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام احکام اپنے بندوں کی ضروریات ان

کی فلاح و بھلائی کو مدنظر رکھتے ہوئے نافذ فرمائے تاکہ ان کے اعمال ان کے لیے رضائے الٰہی کا موجب ہوں۔ کسی طرح عتابِ الٰہی کا سبب نہ بن سکیں اس لیے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عدل وانصاف کو ایک ساتھ استعمال فرمایا ہے۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہ بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے مقلدین نے اجتہاد بالرائے میں زیادہ وسعت نظر سے کام لیا ہے اور بڑے بڑے اہم مسائل کو عوام الناس کے لیے کھول کر آسان تر کر دیا ہے انہوں نے قیاس استعمال کرنے اور اس کے ذریعے استنباط احکام میں تمام احکامِ شرع کے لیے قیاس کو معیار بنا دیا خواہ وہ احکام قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں یا نہ ہوں۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے جس نکتہ شناسی کے معاملات کے احکام منضبط کیے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس پر سیر حاصل مفصل بحث کی جائے لیکن اس مختصر کتاب میں ہم محض چند مخصوص مسائل پر ہی بحث کرسکیں گے۔ ذیل میں مسائل نکاح جو ہماری معاشرت میں روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں پر بات کر رہے ہیں۔ نکاح جو عبادت بھی ہے اور زندگی کے معاملات سے براہ راست متعلق بھی ہے۔ نکاح اور ازدواج کا معاملہ اسلامی نظام حیات اور معاشرت کا نہایت اہم اور وسیع معاملہ ہے۔ نظام زندگی کی بنیاد تہذیب واخلاق اسلامی کی اہم معاشرتی ضرورت ہے نکاح کے اکثر مسائل میں مجتہدین کی مختلف آرا ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اجتہاد سے انہیں آسان اور تیز تر عمل انگیز بنا دیا ہے۔ نکاح کے مسائل جن اصول پر نکلتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱)۔ کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیے۔

(۲)۔ نکاح کے اختیارات کن کو حاصل ہوں۔

(۳)۔ اس کی بقا وثبات اور استحکام کس حد تک ضروری ہے۔

(۴)۔فریقین کے حقوق کیا ہوں گے۔

(۵)۔نکاح کن کن رسومات ورواج کے ساتھ عمل میں آئے۔

(۱)۔ یہ مسئلہ کہ نکاح کی وسعت کو کس حد تک محدود کیا جائے۔تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تمام مسالک میں یکساں طور پر موجود ہیں' ہر قوم نے چند محرمات قرار دیئے ہیں جن کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ محرمات تمام مذاہب میں مشترک ہیں چونکہ یہ اصول فطرت کے مطابق ہے قرآن حکیم نے محرمات کے ناموں یا رشتوں کی تصریح کر دی ہے۔اس مسئلے پر کسی مسلک کو کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن جو جزئیات قرآنی احکامات میں نہیں ہیں ان میں اختلاف موجود ہے۔ جیسے حرمت الزنا کے مسئلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے درمیان شدید اختلاف ہے۔امام شافعیؒ کے مسلک میں زنا سے حرمت کے احکام پیدا نہیں ہوتے جبکہ امام اعظمؒ کو اس سے اختلاف ہے مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک باپ نے کسی عورت سے زنا کیا ہو تو بیٹے کا نکاح اس سے جائز ہے۔امام شافعی نے اس کو مزید وسعت دی ہے کہ اگر زنا سے کسی عورت کو حمل ٹھہر جائے اور اس سے لڑکی پیدا ہو تو وہ زانی شخص اس لڑکی سے اگر نکاح کرنا چاہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔امام شافعیؒ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ زنا حرام فعل ہے اور حرام کو کسی طرح حلال نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک اس کے بالکل خلاف ہے۔ان کے مسلک میں مقاربت کے ذریعے مرد اور عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے اس کو نکاح اور مقاربت کے ساتھ جائز رکھنا اصول فطرت کے بالکل خلاف ہے۔قرآن حکیم میں سورۃ النساء ۲۳ میں جن محرمات کا تذکرہ ہے وہ یہ ہیں (۱) جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کرچکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو۔(۲) تمہاری مائیں (۳) بیٹیاں (۴) بہنیں (۵) پھوپھیاں (۶) خالائیں (۷) بھتیجیاں (۸) بھانجیاں (۹) اور تمہاری وہ مائیں

جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو(۱۰)تمہاری دودھ شریک بہنیں(۱۱)تمہاری بیویوں کی مائیں(۱۲)تمہاری بیویوں کی لڑکیاں، جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو(۱۳)ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمہارا تعلق زن وشو قائم ہو چکا(۱۴)تمہاری ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب سے ہوں(۱۵)دو سگی بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا(۱۶)وہ عورتیں جو پہلے ہی کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

قرآن حکیم میں سورۃ النساء کی آیت ۲۲ میں کہا گیا ہے۔''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے ناپسندیدہ اور برا چلن ہے۔'' اسلامی قوانین میں باپ کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرنا بڑا ہی برا فعل قرار دیا گیا ہے۔ باپ کی زوجیت کے باعث وہ عورت یا عورتیں ماں کے درجے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ چاہے وہ سگی ہوں یا سوتیلی۔ اس لیے اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جرم ہے اور قابل دست اندازی پولیس ہے۔ ابوداؤ' نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کے کرنے والوں کو موت کی سزا اور ان کی جائیداد ضبط کرنے کا حکم دیا ہے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ وکلیہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''جو شخص بھی محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دو۔'' فقہا کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے لیکن امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے میں اگر کسی شخص نے محرمات کے ساتھ زنا کیا ہو تو اس پر حد جاری ہوگی اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرت ناک سزا دی جائے۔

جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ اس مسئلے پر

فقہاء میں اختلاف ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد یہ ہے کہ "جس شخص نے کسی عورت کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالی ہو اس کی ماں اور بیٹی دونوں اس پر حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضاء صنفی پر نظر ڈالے۔"

بیٹی کے حکم میں نواسی اور پوتی دونوں شامل ہیں۔ جبکہ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لڑکی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسی ناجائز تعلق سے پیدا ہونے والی لڑکی حرام ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی لڑکی محرمات میں سے نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وہ لڑکی کسی بھی جائز بیٹی کی طرح محرمات میں سے ہے۔ ایسے ہی بہنوں کے حکم میں، سگی بہن، ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن تینوں ہی بہنوں کے حکم میں یکساں ہیں ان سب رشتوں میں سگے سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

کسی لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا بھی دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں آئے گی اور اس کا شوہر باپ کے درجے میں وہ تمام رشتے جو حقیقی ماں باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں وہ تمام رضاعی ماں باپ کے تعلق سے بھی حرام ہوں گے۔

فقہاء میں رضاعت کے نفاذ میں اختلاف ہے کہ کتنی مقدار میں کسی عورت کا کوئی بچہ دودھ پیے تو رضاعت کی حرمت لاگو ہوگی۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جتنی مقدار سے کسی روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے اگر اتنی مقدار بھی کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تین مرتبہ دودھ پینے سے اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ مرتبہ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اختلاف بھی ہے کہ بچہ کس عمر میں دودھ پیے تو حرمت واجب ہوگی۔

صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اس پر امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ امام احمدؒ امام ابویوسفؒ امام محمدؒ اور سفیان ثوری بھی قائل ہیں کہ دوسال کی عمر کے اندر اندر جو دودھ پیا گیا ہو صرف اس سے حرمت ثابت ہوگی جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ بھی گو کہ اس حد کے قائل ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسال سے اگر مہینہ دو مہینہ زائد بھی ہو تو دودھ پینے کا وہی حکم ہے جبکہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی ایک روایت ہے جسے زہریؒ حسن بصریؒ قتادہؒ عکرمہؒ اور اوزاعیؒ نے بھی قبول کیا ہے کہ صرف اس زمانے میں دودھ پینے کا اعتبار ہے جبکہ بچے کا دودھ چھڑایا نہ گیا ہو اس کی شیر خوارگی ہی پر حرمت رضاعت کا انحصار ہے ورنہ دودھ چھٹائی کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہوگی جیسے اس نے پانی پی لیا ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ کے قول کے مطابق رضاعت کا زمانہ ڈھائی سال ہے اس عرصے کے اندر کسی عورت کا دودھ کوئی بچہ پیے تو رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ ''خالہ بھانجی اور پھوپی بھتیجی کو بھی ایک ساتھ ایک شخص اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا ایسا کرنا قطعی حرام ہے۔''

(۲)۔نکاح کے اختیارات کس کو ہونا چاہئے:۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے نکاح کی اچھائی برائی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عورت چاہے عاقل بالغ ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے نکاح کے بارے میں خودمختار نہیں ہے کسی بھی حال میں وہ اپنا نکاح خود نہیں کرسکتی' نکاح کے لیے ولی کی محتاج ہوگی۔ ان فقہا نے عورت کو اپنے نکاح کے لیے اس قدر پابند کر دیا ہے جبکہ دوسری طرف اس کے ولی کو ایسے وسیع اختیارات دیئے ہیں کہ وہ اگر چاہے تو زبردستی بھی جس شخص سے چاہے اس عورت کا نکاح کرسکتا

ہے۔عورت کی مرضی نہ ہونے کے باوجود بھی انکار نہیں کر سکتی جبکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر بالغ عورت اپنے نکاح کی آپ مختار ہے اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کے ولی نے کہیں کر بھی دیا ہو تو وہ لڑکی بالغ ہونے پر نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔

عورتوں کے حقوق کے مسئلے پر اسلام کے سوا تمام دیگر مذاہب میں بڑی تنگ دلی اور سنگ دلی کا معاملہ نظر آتا ہے۔عورت کو نہایت کمزور اور حقیر گردانا جاتا ہے۔اس لیے اُس کے حقوق کا معاملہ بھی مردوں کے مقابلے میں صفر ہی نظر آتا ہے۔ ہندومت اور عیسائیت میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی اور عورت کو دوسرے درجہ میں رکھا گیا ہے مردوں کو ان پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہے۔ جبکہ اسلام میں مردوں اور عوتوں کے حقوق یکساں بنیادوں پر قائم کیے گئے ہیں۔دیگر فقہا کے مقابلے میں امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے عورتوں کے تمام مسائل میں اصول مساوات کو مدنظر رکھا ہے۔یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کے فقہ کو دیگر آئمہ سے ممتاز کرتی ہے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نکاح' طلاق اور ان کی آزادی عورتوں کی شہادت وغیرہ کے معاملات اسی طرح معتبر ہیں جس طرح کہ مردوں کے جبکہ دیگر آئمہ ومجتہدین کے نزدیک عورتوں کی شہادت کا اعتبار ہی نہیں ہے بعض معاملات میں انہوں نے عورتوں کی شہادت جائز رکھی ہے لیکن اس میں بھی یہ قید و پابندی ہے کہ دو عورتوں سے کم نہ ہوں جبکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو چار سے کم عورتوں کا کسی بھی حالت میں اعتبار نہیں۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس طرح ایک مرد کی گواہی معتبر ہے ایسے ہی عورت کی گواہی بھی معتبر ہے ان کے نزدیک عورتوں کو بھی ایسا ہی اختیار ہونا چاہیے۔

نکاح کا معاملہ ایک خصوصی معاملہ ہے اسے عام معاملات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ نکاح ایک ایسا تعلق ہے جس سے انسان کی پوری زندگی کا تعلق ہوتا ہے۔اس کا اثر پوری زندگی تک قائم رہتا ہے ایسے معاملے میں ایک فریق کو اختیار ہو اور دوسرا قطعی بے اختیار' ایسا

ہونا قطعی نامناسب ہے اس سلسلے میں امام شافعیؒ کی تمام دلیلیں ناکافی اور غیر تسلی بخش ہیں جبکہ امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے دلائل مضبوط اور اہم ہیں۔

ہنسی مذاق کا نکاح یا طلاق واقعہ ہو جاتی ہے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جس میں دل کے ارادے اور سنجیدگی کے ساتھ بات کرنا بھی حقیقت ہے اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا بھی حقیقت ہی کے حکم میں ہے۔ نکاح' طلاق' رجعت (جامع ترمذی' ابی داؤد)

حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اگر کسی نے ہنسی مذاق میں ہی دو افراد کی موجودگی میں کسی خاتون سے یا کسی خاتون نے کسی مرد سے یہ کہہ دیا کہ یہ میرے شوہر ہیں یا یہ میری بیوی ہے تو دونوں کے اس اقرار سے حقیقت میں نکاح قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح ہنسی مذاق میں بیوی کو طلاق دی یا مطلقہ بیوی جسے ایک یا دو طلاقیں دی گئیں ہوں رجعت کی بات کی جائے گی تو بھی رجعت ہو جائے گی۔ شریعت میں یہ سب چیزیں واقع ہو جائیں گی کیونکہ یہ تینوں امر شریعت میں انتہائی نازک اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں ان کے بارے میں ہنسی مذاق کی قطعی گنجائش نہیں۔ ان تینوں معاملات کے بارے میں انسان جو بات بھی زبان سے نکالے گا وہ حقیقت میں واقع ہو جائے گی اس کا مقصد یہ ہوا کہ اسلامی شریعت میں تمام اہم معاملات میں ہنسی مذاق کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (معارف الحدیث از محمد منظور نعمانی)

(۳)۔ تیسری بحث یہ ہے کہ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے:۔ نکاح تمدن کی بنیاد ہے نکاح و شادی کی اصل ذمہ داری منکوحہ عورت پر عائد ہوتی ہے جو ساری عمر کے لیے اپنے مرد کی پابند ہوتی ہے اس لیے نکاح کے وقت اس کی رائے اور رضامندی ضروری ہے۔ اس کی ذات کی مختار وہ خود ہی ہے اس کے ولی وسرپرست کو یہ حق نہیں کہ اس کی

مرضی ورضامندی کے بغیر اس کا نکاح کسی سے کر دے۔ لیکن عورت کے شرف نسوانیت کے اعتبار سے اسے یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنے نکاح کا معاملہ اپنے سر پرست اور ولی کے ذریعے ہی طے کرے وہی لوگ اس کا عقد و نکاح کرنے والے ہوں یہ بات عورت کی نسوانیت اور اس کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے کہ وہ خود اپنے نکاح کے معاملات طے کرے اور خود اپنے آپ کو کسی کے نکاح میں دے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ کسی لڑکی کی شادی ہو یا لڑکے کی اس کے اثرات براہ راست دونوں خاندانوں پر بھی پڑتے ہیں اس لیے بھی خاندانی بزرگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعد میں دونوں خاندانوں میں اختلافات کی بنیاد نہ پڑے اور اس بات کا امکان بھی رہتا ہے کہ اگر عورت خود براہ راست اپنا رشتہ کرے اور خاندان کے افراد بے تعلق رہیں۔ عورت دھوکا کھالے اور کسی چالاک مرد کے بہکائے پھسلائے میں آ کر خود اپنے حق میں کوئی غلط فیصلہ کرے کچھ خاص حالات کے علاوہ نکاح سرپرستوں کی ہی مرضی ونگرانی میں ہو تو بہتر رہتا ہے اور نکاح کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ خفیہ نہ ہو بلکہ کچھ لوگوں کی موجودگی میں اعلانیہ ہو اور کچھ لوگ اس نکاح کے گواہ ہوں جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''نکاح بالاعلان کیا کرو مسجدوں میں کیا کرو اور دف بجوایا کرو۔'' (ترمذی)

شادی ونکاح کی تقریب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دف بجانے کی ترغیب بھی اس لیے ہی فرمائی ہے کہ لوگوں کو اطلاع ہو جائے اور گواہی ہو جائے کہ فلاں کا نکاح فلاں سے ہوا ہے۔ نکاح چوری چھپے نہ ہو کیونکہ اس سے بڑی بدنامی کے علاوہ خاندان کی عزت کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ مسجد میں نکاح کی ترغیب بھی اس لیے ہی دی جا رہی ہے کہ مسجد میں بہت سے نمازی موجود ہوتے ہیں جن کی موجودگی سے گواہی مضبوط و مستحکم ہو جائے گی۔ نکاح کی

شہادت چونکہ اہم ترین معاملہ ہے اس لیے کئی طریقوں سے شہادت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں اپنا نکاح۔شاہد و گواہوں کے بغیر (چوری چھپے) کرلیں وہ حرام کار ہیں۔(ترمذی)

نکاح ہماری تہذیب وتمدن کی بنیاد اس حالت میں ہے جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار پائے ورنہ تو قضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نکاح، مہر کا تعین، طلاق کا اطلاق، خلع کے نفاذ کے لیے اصول وقاعدے واضح فرمائے ہیں۔ زوجین یعنی شوہر، بیوی کے تعلقات اگر اچھے اور مضبوط ہیں تو ان کے درمیان کسی بھی دباؤ یا کسی دوسری وجہ سے طلاق دینا قطعی حرام ہے امام اعظمؒ نے ضرورت اور مجبوری کی حالتوں میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے تو اس کا طریقہ ایسا رکھا ہے جس سے نا صرف اصلاح ہو بلکہ رجوع یا رجعت (عورت کو طلاق رجعی دینے کے بعد پھر زوجیت میں لانا رجعت کہلاتا ہے) کی امید برقرار رہے یعنی وہی طریقہ اپنایا جائے جو قرآن حکیم میں دیا گیا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ

ترجمہ:۔طلاق دو بار ہے پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لینا چاہیے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔(البقرہ۔۲۲۹)

اسی آیت ۲۲۹ کے اس ابتدائی حصے میں ایک بہت بڑی اور اہم معاشرتی خرابی جو عرب میں زمانہ جاہلیت میں رائج تھی کی اصلاح کی گئی ہے۔عرب میں بعثت نبوی سے قبل یہ رواج وقاعدہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو جتنی چاہے بے حد وحساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔

مرد اپنی بیوی کو بار بار طلاق دیتا اور رجوع کرتا رہتا جس سے نہ تو وہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ بس سکتی تھی اور نہ ہی آزاد ہو کر کہیں اور کسی سے نکاح کر سکتی تھی۔ قرآن کریم نے عورت پر ہونے والے اس ظلم کا راستہ روکا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے اس حصے سے یہ بات کھل کر واضح ہو رہی ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ دو طلاق رجعی دے سکتا ہے اس کا طریقہ بھی اسلام نے متعین کر دیا ہے۔ اگر قطع تعلق کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ رہ جائے تو مرد اپنی بیوی کو جب حالت پاکی میں ہو یعنی حالت طہر (حیض سے پاک ہو) تو اس سے صحبت کرنے سے پہلے صرف ایک مرتبہ طلاق دے اور اگر لڑائی جھگڑا ایسے زمانہ میں ہوا جس میں عورت ناپاک یعنی ایام ماہواری میں ہو تو ایسے وقت میں طلاق دینا درست نہیں بلکہ ایام سے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہئے کیونکہ حالت حیض میں طلاق دینا ناجائز اور سخت گناہ ہے اگر غلطی سے کوئی ایسا کرے تو اسے رجعت کر لینا چاہئے کہ حدیث میں آیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خود انہوں نے اپنی بیوی کو ایسی حالت میں کہ انہیں ناپاکی کے ایام جاری تھے ایک طلاق دے دی تو ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس پر بہت سخت برہمی و ناراضگی کا اظہار فرمایا' اور حکم دیا کہ عبداللہ بن عمر کو چاہئے کہ وہ اس طلاق سے رجعت کرے اور بیوی کو اپنے پاس اپنے نکاح میں رکھے یہاں تک کہ ناپاکی کے ایام ختم ہو کر طہر (پاکی کے ایام) آ جائیں' اور پھر اس طہر کی مدت ختم ہو کر دوبارہ ناپاکی کے ایام آ جائیں اور اس کے بعد پھر طہر کی حالت آ جائے تو پھر طہر (پاکی) کی حالت میں اس سے صحبت کئے بغیر اس کو طلاق دے دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی وہ عدت ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری)

طلاق کا صحیح طریقہ ہمیں قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اگر طلاق دینا

لازمی ہے تو اس کی پاکی کی حالت میں صرف ایک طلاق دے اور رجعت اور اصلاح کی ہر امید ختم ہو چکی ہو یعنی قطع تعلق ضروری ہو تو پھر ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ضروری اور لازمی ہونا چاہئے' اللہ تبارک وتعالیٰ بڑا ہی رحیم وکریم ہے۔ وہ اپنے بندوں کے معاملات وحالات سے پوری طرح آگاہ رہتا ہے۔ اگر دو طلاقوں کے درمیانی عرصے میں دونوں میاں بیوی کا غصہ ختم ہو جاتا ہے اور لڑائی جھگڑے کے بعد صلح صفائی ہو جاتی ہے تو پھر طلاق کے ارادے کو تبدیل کرنے کے لیے اس طرح کافی وقت مل جاتا ہے اور اگر شوہر اپنے ارادے سے باز آنا چاہے تو آسکتا ہے اور بہتر صورت بھی یہی ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ مرد کو صرف تین طلاق کا حق دیا گیا ہے جس میں سے وہ پہلا یا دوسرا حق اگر استعمال کر چکا ہوگا تو پھر اس کے بعد ایک اور آخری ہی طلاق کا حق باقی رہ جاتا ہے اگر وہ اُسے بھی استعمال کر لے تو پھر طلاق مکمل ہو جاتی ہے۔ رجعت یعنی واپسی کی راہ بھی بند ہو جاتی ہے۔ تیسری بار طلاق کا عمل ایسا ہی ہے کہ بندوق میں بچی آخری گولی بھی چلا دی جائے تو پھر بچاؤ کا راستہ ہی نہیں رہتا۔

جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ (اگر بہتری اور صلاح کی کوئی صورت نہ نکلے تو) دوسرے طہر (پاکی) میں دوبارہ ایک اور طلاق دے دے ورنہ بہتر تو دونوں کے لیے یہی ہے کہ وہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کریں اس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے اپنی بیوی سے رجوع کرے اور اگر عدت گزر جائے تو بھی دونوں کے پاس یہ موقع رہتا ہے کہ دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ باہم نکاح کر لیں لیکن اگر تیسرے طہر (تیسری پاکی) کے زمانے میں اگر تیسری بار بھی طلاق دے دی تو پھر شوہر کے پاس رجوع کا حق بھی ختم ہو جاتا ہے اور نہ پھر اس کا موقع رہتا ہے کہ دونوں پھر سے نکاح کر لیں۔

جو لوگ اپنے غصے میں آ کر یا جہالت کے تحت ایک ہی وقت میں تین طلاق دے

ڈالتے ہیں جیسا کہ آج کل عام طور پر ہو رہا ہے یہ طریقہ شریعت کے اعتبار سے سخت گناہ کا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سخت مذمت فرمائی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو یہاں تک ثابت ہے کہ ان کے زمانے میں جو شخص اپنی بیوی کو ایک ساتھ ہی تین طلاقیں دے دیتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو درے لگواتے تھے کیونکہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا قرآن اور اسلامی تعلیم کے قطعی خلاف ہے اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروں کی سزا دے کر قرآنی احکام پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے تھے کیونکہ یہ فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی سخت ناپسندیدہ تھا اور قرآن کے احکام کے خلاف عمل کرنے کے باعث گناہ بھی تاہم گناہ ہونے کے باوجود چاروں آئمہ ایک ساتھ دینے والی تین طلاق پر متفق ہیں اس طرح طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق اطلاع ملی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت غصے کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ ابھی جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں کیا کتاب اللہ سے کھیلا جائے گا؟ تو ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس شخص کو قتل ہی نہ کر دوں جس نے یہ حرکت کی ہے۔ (سنن نسائی)

اس حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا ایسا فعل ہے جسے قرآن مجید کے ساتھ (نعوذ باللہ) گستاخانہ کھیل ہو اور مذاق ہو اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناراضگی کے عالم میں یہ فرمانا پڑا کہ میری موجودگی میری زندگی میں ہی کتاب اللہ اور اس کی تعلیم سے مذاق کیا جا رہا ہے۔ تین طلاقیں ایک ساتھ دینا یقیناً بڑا سخت گناہ اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے قانون واحکام کے قطعی خلاف ہے یہ ایسا ہی عمل ہے کہ

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بندوق یا ہتھیار عطا کیا ہے جس میں فقط تین ہی گولیاں ہیں اسے استعمال کرنے کے لیے خصوصی ہدایات بھی بتادی گئیں کہ انتہائی سخت ضرورت کے تحت ہی پہلے صرف ایک گولی چلاؤ اگر اس کے بعد تمہیں پشیمانی ہو اور غصہ فرد ہو چکا ہو تو صلح صفائی ہو سکے اور پہلی طلاق سے زخم خوردہ درست ہو سکے۔ لیکن تمہاری طلاق کی بندوق میں اب دو ہی گولیاں بچ گیں۔ اور اگر تم نے اس ہدایت اور قرآن حکیم کی ترتیب و ترکیب کے خلاف تینوں گولیاں ایک ساتھ چلادیں ہوں تو پھر تمہارے ہاتھ سوائے پچھتاوے کے کچھ اور نہیں بچے گا۔ قرآن حکیم تیسری طلاق دینے کے بارے میں احکام الٰہی کھول کر بتارہا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

ترجمہ:۔ پھر اگر اس کو (دوبار طلاق دینے کے بعد شوہر نے تیسری بار بھی) طلاق دے دی تو اس کے لیے وہ (عورت) حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت کسی دوسرے (مرد) سے نکاح نہ کرلے پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے (یا اس کا انتقال ہوجائے) تو پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کرلینے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کے لیے بیان فرما رہا ہے۔ (البقرہ۔۲۳۰)

اس طلاق سے تیسری طلاق مراد ہے۔ یعنی تیسری طلاق (چاہے وہ ایک ساتھ ہی کیوں نہ دی گئیں ہوں واقع ہوجائیں گی) کے بعد خاوند اب اپنی بیوی سے نہ تو رجوع کرسکتا ہے اور نہ ہی دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔ اب اس پر وہ عورت حرام ہوجائے گی۔ البتہ اگر وہ عورت مطلقہ کسی اور جگہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے اور اگر کسی وقت دوسرا خاوند اپنی مرضی

سے اسے طلاق دے دے یا فوت ہوجائے تو اس کے بعد اس عورت کا عدت گزارنے پر اپنے پہلے شوہر سے نکاح جائز ہوگا لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آج کل جو حلالہ کا طریقہ رائج ہے وہ ایک لعنتی فعل ہے۔ ایسا حلالہ کرانے اور کرنے والے دونوں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ محض حلالہ کی غرض سے کیا گیا نکاح نکاح نہیں فقط زنا کاری ہوگا اور اس طرح سے وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ نے معاملہ نکاح و طلاق کو ایک مضبوط معاملہ سمجھا اور مانا ہے اور ہر حالت میں انہی پر قائم رہنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ دیگر ائمہ خصوصاً حضرت امام شافعیؒ کے یہاں جو اختلاف ہے اسے ذیل میں شق وار تحریر کیا جا رہا ہے تا کہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی میں ہونے والا اختلاف سامنے آسکے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا موقف نکاح و طلاق	حضرت امام شافعیؒ کا موقف نکاح و طلاق
(۱) جب تک فریقین کی حالت میں استقامت ہو طلاق دینا حرام ہے۔	(۱) حرام نہیں ہے
(۲) ایک ہی بار میں تین طلاق دینا حرام ہے اس کا مرتکب نافرمان ہے۔	(۲) کچھ مضائقہ نہیں ہے
(۳) مہر کی مقدار کسی حالت میں بھی دس درہم سے کم نہیں ہوسکتی تا کہ کسی بھی مرد کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرات نہ ہوسکے۔ یہ تعداد غریب و مفلس کے لیے ہے جس کو یہ رقم آسانی سے ممکن نہ ہو۔	(۳) امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایک حبہ بھی مہر ہوسکتا ہے (جس کے باعث مرد بے دریغ اور بغیر سوچے سمجھے طلاق دے سکتا ہے اور عورت اس کی وجہ سے مفلس و نادار رہے گی اور سخت تکلیف کا احتمال بھی ہے۔

(۴)خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہوجاتا ہے۔	(۴) صرف نصف واجب ہوتا ہے۔
(۵) جسمانی بیماری مثلاً برص وغیرہ فسخ نکاح کا سبب نہیں ہوسکتی۔	(۵) امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس وجہ سے نکاح فسخ ہوسکتا ہے۔
(۶) اگر کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت کے زمانے میں اس کا انتقال ہوجائے (عدت گزرنے سے پہلے) تو عورت کو میراث ملے گی۔	(۶) نہیں ملے گی۔
(۷) طلاق رجعی (ایک یا دو طلاق) کی حالت میں وطی (بیوی سے قربت) حرام نہیں ہے یعنی زوجیت کا تعلق ایسی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا۔	(۷) مرد کے لیے بیوی حرام ہوجائے گی گویا وہ بائنہ ہوچکی۔
(۸) رجعت کے لیے زبانی اظہار کی ضرورت نہیں ہے ہر وہ فعل جس سے رضامندی کا اظہار ہو رجعت کے لیے کافی ہے۔ (آسانی دی جائے تاکہ رجعت سہولت سے ہوسکے)	(۸) بغیر اقرار واظہار رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔
(۹) رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر بعض حالتوں میں اگر گواہ نہ مل سکیں اور رجعت کی مدت گزر جائے تو طلاق بائن واقع ہوجائیگی۔	(۹) امام مالکؒ کے نزدیک شہادت ضروری ہے اس کے بغیر رجعت صحیح نہیں ہوگی۔

اسلام نے نکاح کے معاملے میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قائم کیے ہیں کیونکہ نکاح سے عورتوں کو امن وراحت کی توقع ہونی چاہیے یہ نہ ہو کہ ان کے اصل حقوق بھی ختم ہو کے رہ جائیں۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن معاملات میں مساوات حاصل ہے اسے برقرار رہنا ضروری ہے انہیں ختم یا کم نہیں ہونا چاہیے۔ نکاح کے قواعد وضوابط مرتب ہونے کے لیے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ دونوں فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قائم کیے جائیں۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے اس اصول کو تمام مسائل میں ملحوظ رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان سے دیگر آئمہ نے اکثر اختلاف کیا ہے۔

خلع کے بارے میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ اگر عورت کا قصور ہے اور عورت کی بدسلوکی علیحدگی کا سبب ہو تو اس کے مہر کے برابر شوہر کو معاوضہ ملنا چاہیے اور اگر مرد اس مقررہ مقدار سے زیادہ معاوضے کا خواہش مند ہو تو یہ اس کے لیے مکروہ ہوگا اور اگر مرد کی کسی شرارت یا بدسلوکی کے باعث علیحدگی ہو تو عورت بغیر کسی معاوضے یا جرمانے کے خلع کی مستحق ہوگی ایسے میں مرد کو خلع کا معاوضہ لینا مکروہ ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک پہلے معاملے میں یعنی عورت کی بدسلوکی اگر تفریق کا باعث ہو تو مرد جس قدر بھی چاہے معاوضہ لے سکتا ہے اور اس پر عورت کو مجبور کر سکتا ہے اور اگر مرد کا ہی قصور وشرارت کے باعث عورت خلع طلب کرے تب بھی مرد عورت سے جتنا چاہے خلع کے لیے معاوضہ لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریحاً ناانصافی اور غلط ہوگا کہ عورت بے گناہ بھی ہو اور اپنی آزادی کے لیے جبراً معاوضہ بھی ادا کرے۔

(۵)۔ نکاح کن رسموں رواجوں کے ساتھ عمل میں لایا جائے:۔ نکاح کے لیے دو باتیں پیش نظر رہنا بہت ضروری ہیں ایک تو جن کا نکاح ہو رہا ہے یعنی مرد اور عورت دونوں کی مرضی اور رضامندی کی تکمیل ہو دوسرے یہ کہ جب نکاح ہو اس کی اطلاع عام ہو جائے

یعنی گواہوں کی موجودگی میں ہو۔مجلس نکاح میں جتنے زیادہ افراد ہوں گے اتنی ہی گواہیاں اور شہادت مضبوط ہوگی۔اس غرض سے حضرت امام اعظمؒ نے نہایت مناسب اور آسان قاعدے تشکیل کئے ہیں یعنی دونوں فریق ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے یہ ظاہر ہو کہ انہوں نے نکاح کو قبول کرلیا ہے۔ ہر نکاح کم از کم دو گواہوں کے سامنے ہو یہ دونوں بالکل سادہ اور آسان شرطیں ہیں جو آسانی سے ہر موقع پر استعمال کی جاسکتی ہیں۔جبکہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق گواہانِ نکاح کا عادل ہونا شرط ہے ورنہ نکاح درست نہیں ہوگا۔ عدالت یا عدل کے معنی جو خود حضرت امام شافعیؒ نے بیان کئے ہیں اس کے لحاظ سے تو ہزاروں میں شاید ایک آدھ ہی عدل کی کسوٹی پر پورا اترے اگر یہ قید لازمی سمجھی جائے تو صحیح نکاح کا ہونا انتہائی مشکل ہو جائے۔امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ضروری ہے کہ گواہان مرد ہی ہوں لیکن امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک مرد اور دو عورتیں بھی گواہ ہوسکتی ہیں۔

نان نفقہ

دین اسلام میں زوجین (میاں بیوی) کے باہمی حقوق و فرائض کو بڑے جامع اور مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کسی بھی فریق کی حق تلفی صرف اس وجہ سے ممکن نہیں کہ وہ نکاح کے ذریعے ایک دوسرے کے لئے کس طرح قید ہوں۔ اسلام مرد اور عورت کے جداگانہ طبعی میلانات اور جنسیاتی اختلافات کے پیش نظر دونوں کو الگ الگ ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ایک مرد جب کسی عورت کو نکاح کے ذریعے قبول کرتا ہے' اسے اپناتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس عورت کے تمام اخراجات' کھانے پینے اور رہنے سہنے یعنی رہائش کا انتظام کرنا مرد کی ذمہ داری ٹھہرتا ہے۔ بیوی کے اس حق کو شریعت میں حق نفقہ کہا جاتا ہے۔ بیوی کے اس حق کی وجہ سے ہی مرد کو قوام یعنی نگران اور حاکم کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

نفقہ کے لغوی معنی خرچ کرنا اور نکال دینا کے ہیں۔فقہی اصطلاح میں نفقہ وہ خرچہ ہے جو شوہر پر اس کی بیوی کے لئے عائد کیا گیا ہے۔اس میں عورت کے لئے مرد کو جو اہتمام و انتظام کرنا ہے وہ ہے روٹی' کپڑا' گھر بار اور تمام ضروری اشیاء جو ضروریات زندگی کا حصہ ہیں۔نفقہ وہ روزینہ ہے جو زندگی باقی رکھنے کے لئے ضروری ہو۔نفقہ اس رقم یا خرچ کو کہا جاتا ہے جو آدمی اپنے اہل وعیال وغیرہ پر خرچ کرتا ہے۔نفقہ زوجہ کا معاوضہ ہے جس میں خوراک' لباس' مکان شامل ہیں (بحر الرائق۔عین العدایہ۔مجموعہ قوانین اسلام)

نفقہ کی شرعی حیثیت واجب کی ہے جس کا مہیا کرنا خاوند' باپ یا آقا پر واجب ہوتا ہے۔شریعت اسلام نے بیوی کا نان نفقہ بہر حال ہر صورت میں ادا کرنے کو لازمی قرار دیا ہے۔چاہے کتنی ہی تنگی یا خوش حالی کیوں نہ ہو اس پر قرآن حکیم اور احادیث کا اجماع ہے۔

نفقہ کی ادائیگی واجب ہے۔اگر شوہر اپنی بیوی کا نان نفرقہ ادا نہ کرتا ہو یا مالی طور پر ایسا بدحال کمزور ہو کہ تنگی کے باعث نفقہ ادا نہ کرسکتا ہو تو زوجین میں اختلاف پیدا ہونے کے باعث کیا علیحدگی یعنی طلاق واجب ہو جائے گی۔اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دیگر آئمہ ثلاثہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اگر شوہر اپنی بیوی کو نان نفقہ نہ دے سکتا ہو' اپنی تنگ دستی بے روزگاری یا ایسی ہی کسی اور وجہ سے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تفریق نہیں ہوگی۔اگر شوہر اپنی تنگ دستی کے باعث نفقہ ادا نہ کرسکتا ہو تو تفریق نہیں ہوگی۔ایسی کوئی مثال دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہیں ملتی۔ہاں اگر شوہر فارغ البال ہونے کے باوجود نفقہ ادا کرنے سے گریز کرے تو قاضی تفریق (طلاق) کا حکم دینے کے بجائے شوہر کو قید کر کے اس کے مال سے عورت کو نفقہ ادا کرے اور تنگ دستی کی صورت میں مرد کو مہلت دی جائے تاکہ وہ فارغ البال ہو کر نفقہ ادا کرسکے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ تنگی کے بعد فراغت عطا کرے گا۔جبکہ مالکیہ' شافعیہ

اور حنبلہ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر شوہر تنگ دست ہو اور اپنی بیوی کو نفقہ ادا نہ کر سکتا ہو اور عورت صبر نہ کر سکے تو عورت کو اپنا معاملہ عدالت میں پیش کرنے کا اختیار ہو گا اور عدالت یا تو شوہر کو نفقہ ادا کرنے پر مجبور کرے گی یا نکاح ختم کر دے گی۔

ایسا خاوند جو اپنی بیوی کے اخراجات (ضروری جس کی شریعت نے وضاحت کر دی ہے) پوری نہ کر سکے حضرت امام مالکؒ نے ایسے خاوند کو ایک ماہ کی مہلت دینے کی سفارش کی ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ ایسے شخص کو صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں یعنی اگر تین دن میں شوہر اپنی بیوی کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہ ہو سکے تو چوتھے روز ان کا نکاح فسخ (یعنی ختم) کیا جا سکتا ہے جبکہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے کہ اگر معاملہ عدالت میں لے جایا جائے تو یہ عدالت پر منحصر ہے کہ وہ ان کا نکاح فسخ کر دے یا شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کر دے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ استاد حضرت امام حماد کے مطابق ایسے تنگ دست خاوند کو کم از کم ایک سال کی مہلت دینی چاہئے تاکہ وہ اس قابل ہو سکے کہ اپنی بیوی کے اخراجات احسن طریقے سے پورے کر سکے۔ اس مدت کے دوران بیوی اس سے علیحدگی کا مطالبہ نہ کرے۔

مالکیہ' شافعہ اور حنبلہ کے آئمہ ثلاثہ اس بات پر متفق ہیں کہ نفقے کی عدم فراہمی کی صورت میں عورت کو حق حاصل ہے کہ علیحدگی اختیار کر لے اور نکاح فسخ کرا لے جبکہ حنفیہ کے مسلک کے مطابق اگر شوہر خوشحال رہے اور نفقہ ادا نہیں کرتا تو عدالت اسے سزا دے کر مجبور کر دے کہ وہ نفقہ ادا کرے اور اگر تنگ دست ہو تو اسے مہلت دے تاکہ وہ فارغ البال ہو کر اپنی بیوی کو نفقہ ادا کر سکے لیکن نفقہ ادا نہ کرنے سے میاں بیوی میں تفریق نہیں کرنا چاہئے۔

فقہی مسائل

فقہ کا ایک بڑا حصہ دنیوی ضرورتوں سے متعلق ہے جس میں مجتہدین کا اپنا اپنا نکتہ نظر کھل کر سامنے آیا ہے جس سے ان کی نکتہ شناسی کا درست اندازہ ہوسکتا ہے۔ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک معاملات کے احکام بالکل ابتدائی حالت میں تھے نہ تو معاہدات کے استحکام کے قواعد وضوابط ضابطہ تحریر میں آسکے تھے اور نہ ہی دستاویزات کی تحریر کا کوئی اصول قائم ہوسکا تھا اور نہ ہی شہادت کا کوئی قانون باقاعدہ مقرر تھا۔ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے ان چیزوں کے قانون کو تحریری صورت دی۔

فقہ کا ایک بڑا حصہ حلال وحرام، جائز وناجائز کی تفصیل کے متعلق ہے آئمہ ومجتہدین کے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر اگر عمل ہو تو زندگی دشوار ہو کر رہ جائے جبکہ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے احکام ان ہی مسائل پر نہایت آسان اور سہل ہیں جیسے کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جو پانی اپلوں کی آگ سے گرم کیا گیا ہو اس سے غسل اور وضو کرنا جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی مٹی کے برتن میں اپلوں کی آگ پر پکایا گیا کھانا ناجائز ہے اسی طرح رانگ، کانچ (شیشے) یعنی بلور عقیق کے برتنوں کا استعمال ناجائز ہے۔ پشمینہ، آمور، پوستین وغیرہ کا استعمال کرنا ناجائز ہے اور ان کو پہن کر نماز نہیں ہوسکتی اور اگر برتنوں، کرسیوں زمین پر چاندی کا کام ہو تو ان کا استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ خرید وفروخت کا عام طریقہ جس میں بیع وشرا کی کی تصریح نہیں کی جاتی وہ بھی ناجائز ہے جبکہ ان تمام مسائل میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک حضرت امام شافعیؒ سے مختلف ہے یعنی ان تمام مسائل میں سب چیزیں جو امام شافعیؒ کے نزدیک ناجائز ہیں، وہ سب فقہ حنفی میں جائز ہیں۔ حنفی فقہ دوسرے تمام فقہوں

کی طرح تنگ اور سخت نہیں ہے۔

حضرت امام شافعی ہبہؔ کے لیے قبضے کو ضروری نہیں سمجھتے' حق شفعہ ہمسائے کا حق ان کے یہاں جائز نہیں ہے تمام معاملات مستورالحال شہادت کو وہ ناجائز قرار دیتے ہیں۔ایسے ہی نکاح کے گواہوں کا ثقہ یعنی قطعی عادل ہونا ضروری ہے ورنہ نکاح ہی منعقد نہیں ہوگا۔ ذمیوں (ایسے غیر مسلم جو ٹیکس دے کر مسلم ریاست میں رہتے ہیں) کے باہمی معاملات میں بھی ان کی شہادت کو جائز نہیں مانتے۔ان تمام مسائل میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا حضرت امام شافعیؒ سے اختلاف ہے۔ ابن خلدون کے مطابق امام مالکؒ وشافعیؒ کا مسلک ایسے مما لک میں رواج پاسکا ہے جہاں تمدن نے وسعت حاصل نہیں کی تھی۔

سرقہ یعنی چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔جیسا کہ قرآن حکیم میں رب کائنات کا حکم ہے لیکن مجتہدین نے چوری کی تعریف میں چند شرائط اور پابندیاں لگائی ہیں جن کے بغیر ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاسکتی ان شرائط کو جاننے سے پہلے ہم قرآنی حکم کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

ترجمہ:۔اور چور' خواہ مرد ہو یا عورت' دونوں کے ہاتھ کاٹ دو' یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔(المائدہ۔۳۸)

فقہا کے نزدیک چوری کی سزا کا یہ حکم عام ہے چاہے چوری تھوڑی ہو یا زیادہ چیز کی۔ ایسے ہی محفوظ جگہ رکھی ہو یا غیر محفوظ جگہ ہر صورت میں چوری کی سزا دی جائے گی۔

فقہا میں سزا کے نصاب کے تعین میں اختلاف ہے کہ کتنے مال کی چوری ہو تو ہاتھ کاٹا جائے۔اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی

قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک ڈھال کی قیمت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق دس درہم تھی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق تین درہم تھی اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ پانچ درہم تھی۔ جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ چوتھائی دینار۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات کے اس اختلاف کے باعث فقہا کے درمیان کم سے کم نصاب سرقہ (چوری) میں اختلاف پیدا ہوا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک چوری یعنی سرقہ کا نصاب دس درہم ہے جبکہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایک چوتھائی دینار (اس زمانے کے مطابق ایک چوتھائی دینار تین درہم کے برابر ہوتا تھا)

بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ پھل، ترکاری، کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ کھانے کی چوری میں قطع ید نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حقیر چیزوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے صحابہ کرام میں سے کسی نے کبھی اس پر اختلاف نہیں کیا۔ ایسے ہی پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اس معاملے میں بھی صحابہ کرام کا کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا۔ ذیل میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور دیگر آئمہ کا چوری کے مسائل پر ہونے والے اختلاف کو ظاہر کر رہے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق مسائل سرقہ وسزا	دیگر آئمہ کے مطابق مسائل سرقہ وسزا

(۱) ترکاری، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیانہ کیا گیا ہو (سزا نہیں دی جائے گی)	امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ہر ایک کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ (سزا ملے گی)
(۲) کھیل اور گانے بجانے کے آلات کی چوری (سزا نہیں دی جائے گی)	امام مالکؒ کے نزدیک سزا ہے۔ (سزا ملے گی)
(۳) جنگل میں چرتے ہوئے جانور اور بیت المال کی چوری (سزا نہیں دی جائے گی)	دیگر آئمہ کے نزدیک سزا ملے گی
(۴) چوری (سرقہ) کا نصاب کم از کم ایک اشرفی ہے اگر ایک نصاب میں کئی چوروں کا ساجھا ہے تو کسی کے ہاتھ نہیں کٹے گا۔	امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔
(۵) نادان بچے پر قطع ید نہیں ہے۔	امام مالکؒ کے نزدیک کٹے گا۔ (سزا ملے گی)
(۶) کفن چور پر قطع ید نہیں ہے۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)
(۷) میاں بیوی اگر ایک دوسرے کا مال چرائیں تو قطع ید نہیں۔	امام مالکؒ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)
(۸) بیٹا اگر باپ کا مال چرائے تو ہاتھ نہیں کٹے گا۔	امام مالکؒ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)
(۹) چچا، بھائی یعنی قریبی رشتہ دار، ہاتھ نہیں کٹے گا۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔
(۱۰) اگر کسی شخص نے کسی سے کوئی چیز ادھار لی اور دینے سے انکار کر دے تو ہاتھ نہیں کٹے گا۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)

(۱۱) ایک شخص نے کوئی چیز چرالی پھر ہبہ یا بیع کے ذریعے اس کا مالک بن گیا تو قطع ید نہیں ہوگا۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔
(۱۲) غیر مذاہب کے لوگ اسلامی حکومت میں رہتے ہیں اگر چوری کرلیں تو ان کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)
(۱۳) قرآن کی چوری کرنے پر ہاتھ نہیں کٹے گا۔	امام شافعیؒ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔
(۱۴) لکڑی یا ایسی چیزیں جو جلد خراب ہوجاتی ہیں ان کی چوری پر ہاتھ نہیں کٹے گا۔	دیگر آئمہ کے نزدیک ہاتھ کٹے گا۔ (سزا ملے گی)

قطع ید کی سزا میں دونوں ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ پہلی بار چوری کرنے پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق سرقہ یعنی چوری کا اطلاق خیانت پر نہیں ہوتا صرف اس فعل پر ہوتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کی حفاظت میں سے مال نکال کر اپنے قبضے میں کرلے۔

آج کے معاشرے میں اکثر اسلام سے ناواقف افراد اور خصوصاً اسلام دشمن اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے حالانکہ اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی پہ حاوی ہے۔ اسلام لوگوں کے ضمیر اور اخلاق کی تربیت پر زور دیتا ہے اور رزق حلال اور حلال کمائی و روزگار پر زور دیتا ہے۔ اور حلال روزی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق حاصل کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔ اگر کسی کو روزگار نہ ملے تو اسلامی نظام حیات لوگوں کی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے (صدقات' خیرات' زکوٰۃ' بیت المال) اسلام پاک

صاف اور حلال ذرائع فراہم کرتا ہے تاکہ اہل ایمان کی کفالت ہو سکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے نظام حیات و معاشرے میں اگر کوئی چوری کرتا ہے تو کیوں کرتا ہے اکثر لوگ چوری ضروریات زندگی کے لیے نہیں بلکہ دولت کے حصول اور جمع کرنے کے لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ دولت کو حلال ذرائع سے حاصل کر کے جمع نہیں کر سکتے اس لیے چوری کا راستہ اپناتے ہیں اور دوسروں کی دولت چراتے ہیں۔ اسلام اپنے معاشرے کو پرامن پرسکون بناتا ہے لیکن ایسے لوگ معاشرے میں بے چینی واضطراب پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جبکہ اسلامی معاشرے کا یہ حق ہے کہ وہ پرسکون اور پرامن طور پر جاری وساری رہے لیکن چور اور اس کی چوری کا فعل ایک حلال مال کے مالک کو اس کے حق ملکیت سے محروم کرتا ہے اس لیے ایسے شخص کو سزا دینی ہی چاہئے تاکہ اسلامی معاشرے میں ایسا سوچنے والے عبرت حاصل کریں اور اسلامی معاشرہ بے چینی' بے کلی' بدامنی سے محفوظ و مامون رہ سکے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن حکیم میں تمام باطل طریقوں سے مال کے حصول سے روک رہا ہے جیسا کہ النساء آیت ۲۹ میں فرمایا جارہا ہے (ترجمہ) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ لین دین ہونا چاہئے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر مہربان ہے۔

آیت مبارکہ میں باطل طریقوں سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلاف حق ہیں جو شرعاً' اخلاقاً ناجائز ہیں تاکید کی جارہی ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے کیونکہ اس طرح دنیا میں نظام تمدن خراب ہوتا ہے یہ تاکید بھی کی جارہی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا خیر خواہ اور مہربان ہے' وہ تمہاری بھلائی خیر خواہی چاہتا ہے یہ تو اس کی مہربانی اور احسان ہے کہ وہ تمہیں ایسے تمام برے کاموں سے منع فرمارہا ہے۔ جن سے

تمہاری تباہی و بربادی کا سامان ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورت (اپنی عورت یعنی بیوی) کو صرف چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جبکہ حضرت امام شافعیؒ اس کے مخالف ہیں ان کے نزدیک صرف چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

مسئلہ:۔حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ ایک تیمّم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں جبکہ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق ہر فرض کے لیے نیا تیمّم کرنا چاہیے۔ اس مسئلے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا استدلال یہی ہے کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمّم کی ہے جب ہر نماز کے لیے وضو کی ضرورت نہیں (اگر وضو ہے) تو تیمّم کی تجدید کی بھی ضرورت نہیں۔

مسئلہ:۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تیمّم کر کے نماز پڑھنے والے شخص کو نماز کے دوران ہی پانی میسر آ جائے تو اس کا تیمّم ختم ہو جائے گا۔ اسے وضو کرنا ہوگا۔ جبکہ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اس کے مخالف ہیں۔ حضرت ابوحنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید میں تیمّم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ جب پانی نہ ملے لیکن جب یہ شرط باقی ہی نہ رہے یعنی پانی میسر آ جائے تو مشروط بھی باقی نہیں رہے گا یعنی تیمّم ختم ہو جائے گا۔

مسئلہ۔حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق تکبیر تحریمہ صرف اللہ اکبر پر منحصر نہیں ہے۔ فارسی زبان میں تکبیر کہنا بھی درست ہے جبکہ امام شافعیؒ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ جس آیت کریمہ سے تکبیر کی فرضیت ثابت کی گئی ہے اس میں زبان کی کوئی خصوصیت نہیں اس لیے نماز کا وجود تکبیر سے موخر ہونا ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تکبیر تحریمہ گو کہ فرض ہے لیکن نماز میں داخل نہیں اور نہ ہی جز و نماز ہے؟

مسئلہ:۔ حضرت امام اعظمؒ کا قول ہے کہ مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ ضروری نہیں جبکہ حضرت امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ قرأت فاتحہ کو مقتدی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ کا یہ استدلال ہے کہ قرآن حکیم میں کہا گیا "جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپکے رہو۔" اگرچہ اس آیت سے سری (خاموشی یعنی ظہر اور عصر کی نماز ہے) نمازوں میں بھی مقتدی کے لیے ترک قرآت کا حکم ثابت ہوتا ہے لیکن خاص کر جہری نماز کے لیے نص قطعی ہے جس کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔

مسئلہ:۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک میں وضو کے صرف چار فرض ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ المائدہ میں موجود ہے۔ جبکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک چھ فرض ہیں۔ وہ نیت اور ترتیب جبکہ حضرت امام مالکؒ موالاۃ کو فرض کہتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وضو کے وقت بسم اللہ کہنا ضروری ہے اگر جان بوجھ کر قصداً بسم اللہ نہ کہی تو وضو ہی نہیں ہوگا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا اس بارے میں یہ استدلال ہے کہ قرآن حکیم میں صرف چار فرائض مذکور ہیں اس لیے جو چیزیں ان احکام کے علاوہ ہیں وہ فرض نہیں ہوسکتی کیونکہ نیت کرنے کا موالات اور تسمیہ کا قرآن کریم کی آیت میں کہیں ذکر نہیں اور ترتیب کا گمان واؤ کے حرف سے پیدا ہوتا ہے لیکن علماء عربی نے متفقہ طور پر طے کر دیا ہے کہ وہ واؤ کے مفہوم میں ترتیب نہیں آتی۔

مسئلہ:۔ مردہ یا مردار کے کیا معنی ہیں؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ اس کے عام معنی ہی لیتے ہیں جن کا اطلاق عام ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ نے اسے وسعت دی ہے۔ ان کے نزدیک مردار جانوروں کے بال اور ہڈیوں تک کو وہ مردہ قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے ہی ان کی رائے میں ان تمام چیزوں کا استعمال جائز نہیں اور حضرت امام مالکؒ مردار جانور کے بال اور کھال کو کام میں لانا جائز قرار دیتے ہیں لیکن ہڈیوں کا استعمال ان کے نزدیک حرام ہے۔

مسئلہ:۔خون جس کو قرآن مجید کی آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟
حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسفوح (ذبح کے وقت جو خون جانور سے نکلتا ہے وہ حرام ہے) لیکن جس خون میں روانی ہو اس بنا پر مچھلی کا خون وہ حرام نہیں کہتے جبکہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک کوئی تخصیص نہیں ہر قسم کا خون حرام ہے۔ امام اعظمؒ کا استدلال ہے کہ قرآن حکیم میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے۔ خون کی حرمت یعنی حرام ہونے کو مسفوح یعنی گرا ہوا ہونے کے ساتھ قید کر دیا ہے۔

مسئلہ:۔کھانے میں بغاوت سے کیا مراد ہے؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ کھانے میں بغاوت سے مراد ہے کہ کوئی شخص بھوک سے ایسا مجبور ہو اور جاں بلب ہو کہ زندگی کے لالے پڑ رہے ہوں تو اس کو مردار اور سور کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن اس شرط پر کہ اس کی مقدار سد رمق یعنی اس قدر کھانا جس سے دن گزر جائے یا اتنا کھانا کہ جس سے جان بچ جائے۔ جبکہ حضرت امام شافعیؒ بغاوت اور عدوان سے مراد لیتے ہیں کہ اس شخص نے سلطان وقت سے بغاوت کی ہو اور گناہ گار ہو تو بھی وہ باغی اگر فاقہ سے جاں بلب ہو تو بھی مردار نہیں کھا سکتا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جاں بلب فاقہ زدہ مردہ یا سور کا گوشت بقدر سد رمق، جس سے دن گزر سکتا ہو کھا سکتا ہے جبکہ امام شافعیؒ کے مطابق اگر وہ باغی نہ ہوتا اور گناہ گار نہ ہوتا تب فاقے کی حالت میں وہ مردار کھا سکتا تھا لیکن بغاوت کی حالت میں اس کو اجازت نہیں ہے۔

اسی مسئلے سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص پیاس کے باعث جاں بلب ہو اور ایسے وقت میں اسے شراب کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز دستیاب نہ ہو جسے پی کر اس کی پیاس بجھ سکے یا پیاس کا مداوا ہو سکے تو اسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے ایسی حالت میں شراب پینے کی اجازت ہے کہ نہیں؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسی حالت میں وہ

جان بچانے کے لیے شراب پی سکتا ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ اس کی اجازت نہیں دیتے۔
حضرت امام ابوحنیفہؒ کے استدلال کے مطابق قرآن کریم نے جس حالت میں حرام یا مردار کھانے کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے دونوں کی علت مشترک ہے یعنی حفاظتِ نفس اور اس حکم کے مشترک نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مسئلہ:۔ قصاص یعنی قتل عمد کے بدلے میں مالی یا جانی معاوضہ لینا۔ قصاص کی تشریح جس طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ نے کی ہے کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی۔ زمانہ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے وہ نہایت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔ اسلام نے نا صرف ان کی اصلاح کی اور اس سلسلے میں احکام بھی مقرر کیے جن کے باعث تمام مسائل کھل کر سامنے آ گئے۔ قصاص کے بارے میں سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۸ میں اللہ تبارک تعالیٰ حکم فرما رہا ہے۔

ترجمہ:۔ اے ایمان والوں! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے' آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے بدلے غلام' عورت کے بدلے عورت' ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہئے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہئے۔ تمہارے رب کی یہ تخفیف اور رحمت ہے۔ اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے (البقرۃ۔ ۱۷۸)

زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ مقتول کی قوم قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا اہم اور قیمتی سمجھتے تھے اتنی ہی اس خون کی قیمت لگا کر قاتل کے خاندان قوم قبیلے سے وصول کرنا چاہتے تھے۔ صرف قاتل کی جان لے لینے سے مطمئن نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ قاتل کی پوری قوم قبیلے سے لینا چاہتے تھے اور بیسیوں آدمیوں کو مار کر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ دوسرے قبیلے سے قصاص لینے کے لیے اپنے غلام

کے بدلے دوسرے قبیلے کے آزاد فرد کو اور اپنی عورت کے بدلے ان کے مرد کو اور اپنے ایک مرد مقتول کے بدلے دوسرے قبیلے کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قصاص کا حکم عام صادر فرما کر ہر قتل کے قصاص کا تعین فرما دیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگی کہ قصاص کا حکم کسی طرح کی تبدیلی کا متحمل نہیں ہے۔ قاتل مقتول کے بدلے میں لازماً مارا جائے گا۔ اسلام سے پہلے لازماً ایسا ہی ہوتا تھا لیکن قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''بھائی'' کا لفظ استعمال کر کے شفقت ترس کے طریقوں کا اظہار کیا ہے چاہے دوسرے شخص سے کیسی ہی دشمنی کیوں نہ ہو مگر وہ تمہارا دینی اخلاقی انسانی رشتوں سے بھائی ہے اگر مقتول کے ورثا اپنے خطا کار بھائی قاتل کے مقابلے میں اپنے غصے کو پی جائیں اور انتقامی جذبے پر قابو پا کر قاتل کی جان کو معاف کر دیں یا مقتول کے خون کے بدلے دیت یعنی معاوضہ مقرر کر لیں۔ اس آیت مبارکہ کے اس حصے سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ قرآن حکیم اور اسلامی قانون تعزیرات میں قتل کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق ہے کہ وہ قاتل کو معاف کر دیں۔ اور آیت مبارکہ میں دیئے ہوئے نسخے کے مطابق مقتول کا خون بہا لے لیں۔ چونکہ مقتول کے ورثا نے قاتل کے ساتھ اس کی جان بخشی کر کے اس پر احسان کیا ہے اس احسان کو وہ نا صرف یاد رکھے بلکہ طے ہونے والا خون بہا بھی مقتول کے وارثوں کو اچھی طرح طے شدہ معاہدے کے مطابق ادا کرے اور کسی طرح کی احسان فراموشی نہ کرے۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا معمول تھا کہ جو احکام قرآن کریم سے صاف اور صریح ثابت ہوں ان میں کوئی رائے یا اختلاف کی ضرورت نہیں وہ قرآنی احکام کے قائل تھے۔ جبکہ حضرت امام شافعیؒ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ البقرۃ کی آیت میں کہا گیا ہے کہ غلام کے بدلے غلام اور آزاد کے بدلے آزاد لیکن اگر کسی آزاد شخص نے کسی غلام کو قتل

کر دیا ہو یا کسی غلام نے آزاد فرد کو قتل کر دیا ہو حضرت امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کے مطابق غلام کے بدلے آزاد اور آزاد کے بدلے غلام قتل نہیں کیا جا سکتا ان کی اس رائے کے مطابق تو عورت کے بدلے مرد بھی قتل نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا نہیں ہے۔

دوسرا اختلاف امام شافعیؒ ذمی (ایسا غیر مسلم جو اسلامی ریاست میں ٹیکس دے کر رہتا ہو) کی دیت میں کرتے ہیں اور اسے مسلمان کی دیت سے کم قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن حکیم میں دیت کے جو الفاظ رب کریم نے مومن کے حق میں استعمال کیے ہیں وہی ان لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کیے جو مسلمانوں سے معاہدہ رکھتے ہیں۔ یہ اسلام کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے کہ اس نے ایک مسلمان اور ذمی کے حقوق کو برابر رکھا۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتل عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں ہے صرف قصاص ہے جبکہ حضرت امام شافعیؒ قصاص و کفارہ دونوں کو لازمی قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن حکیم میں کفارے کا حکم قتل خطا کے لیے آیا ہے قتل عمد میں کفارے کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے ہی حضرت امام شافعیؒ قتل عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں جبکہ قرآن حکیم میں قتل عمد کے لیے قصاص کا حکم ہے۔

وراثت:۔ وراثت کے معاملات کے بارے میں جو احکام قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نافذ فرما دیے ہیں امام ابوحنیفہؒ دیگر مسائل معاملات کی مانند اس پر بھی احکام الٰہی کے تابع فرمان ہیں۔ ہاں ان کے ذیلی شقوں اور ان حقوق وراثت کے بارے میں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا دیگر آئمہ سے کسی قدر اختلاف کرتے ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ پوری طرح قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن حکیم میں جو وراثت کے قاعدے مقرر کیے ہیں وہ تمام دیگر مذاہب عالم سے مختلف اور الگ ہیں لیکن قانون وراثت اسلام کے مکمل آئینہ دار اور مستحکم ہیں اس میں کسی دلیل کی گنجائش اللہ تبارک وتعالیٰ نے رہنے

ہی نہیں دی جیسا کہ سورۃ النساء میں آیا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝

ترجمہ:۔ مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ (النساء۔۷)

آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ وراثت یا ترکہ یا میراث کے بارے میں واضح احکام دے رہا ہے اس آیت میں واضح طور پر میراث کے پانچ قانونی حکم صادر کئے گئے ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ میراث صرف مردوں کا ہی حصہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ (۲) دوسرے یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہئے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے صرف ایک گز کپڑا ہی کیوں نہ چھوڑا ہو اگر مرنے والے کے دس وارث ہوں تو اس کپڑے کو وارثوں کے حق کے مطابق لازمی تقسیم ہونا چاہئے۔ اس میں یہ بھی ممکن صورت ہو سکتی ہے کہ کوئی ایک وارث جو صاحب مال یعنی دولت مند ہو وہ دوسرے وارثوں سے ان کے حصے کی قیمت ادا کر کے ان کا حصہ خرید لے اور اپنی ملکیت بنا لے۔ (۳) تیسرے اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے مال، اموال واملاک پر جاری ہوگا جو کچھ بھی مرنے والے کی ملکیت میں تھا چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ زرعی ہو یا صنعتی یا کسی اور صنف مال میں شمار ہوتا ہو یعنی شیئر بانڈ وغیرہ غرض جو کچھ بھی اور جیسا بھی ہوگا وہ مرنے والے کے ورثا میں حق وانصاف کے ساتھ تقسیم ہونا لازمی امر ہے۔ (۴) چوتھے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق وراثت اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب

مرنے والا کوئی چیز کوئی مال و دولت چھوڑ کر مرے۔(۵) پانچواں قانون اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور پرے کے رشتہ دار میراث کے حق دار نہیں ہوں گے۔

اسلام سے قبل یہ ظلم اور رواج تھا کہ میراث صرف مردوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔ وراثت کا حصہ صرف بڑے لڑکے جو لڑنے کے قابل ہوتے سارے مال کے حق دار ہوتے تھے لیکن اسلام جو عدل وانصاف کا علمبردار اور تہذیب کا مذہب ہے اس نے مردوں کی طرح عورتوں بچے بچیوں کو بھی والدین واقارب کے مال میں حصہ دار بنایا ہے اس لیے انہیں وراثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام وراثت میں بھی تہذیب وشائستگی کی تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی آیت مبارکہ میں اہل ایمان کو ہدایت کی جارہی ہے کہ اگر تقسیم وراثت کے وقت تمہارے کنبے کے نادر غریب یتیم افراد بھی موجود ہوں اور وراثت میں تقسیم ہونے والا مال و دولت اس قدر ہو کہ سب وارثوں کے حصے میں اچھا خاصا مال آ رہا ہو تو اپنے کنبے کے یتیم وغریب افراد کو بھی اس مالِ وراثت میں سے دے دینا چاہئے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہدایت عام ہے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝

ترجمہ:۔ اور جب (وراثت) کی تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ (النساء۔۸)

آیت مبارکہ میں مرنے والے کے وارثوں کو واضح ہدایت دی جارہی ہے کہ تقسیم میراث کے موقع پر اگر دور نزدیک کے غریب مسکین رشتہ دار اور یتیم بچے آجائیں تو ان کے

ساتھ تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا جائے کیونکہ مرنے والے کی میراث میں شرع کے قانون وقاعدے کے مطابق ان کا حصہ گو کہ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت فرما رہا ہے کہ وسعت قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو ان کے ساتھ نرم رویہ رکھو دل شکنی اور چھوٹے دل اور کم ظرفی کی بات نہ کرو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ایک بہت ہی اہم اخلاقی ہدایت فرمائی ہے امداد کے مستحق ایسے رشتہ دار جو وراثت میں تو حصہ دار نہ ہو لیکن ضرورت مند ہوں انہیں بھی تقسیم میراث کے وقت کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے تاکہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو سکے اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا سا دینے پر راضی نہ ہوں اور دوسروں کے برابر حصے کا مطالبہ کریں تو انہیں نرمی سے سمجھا دینا چاہئے کیونکہ ان کا مطالبہ قانون شرع کے خلاف اور غیر منصفانہ ہوگا جسے پورا کرنے کی گنجائش ممکن نہیں لیکن انہیں اس طرح سمجھایا جائے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو (معارف القرآن)۔ اس کے بعد آنے والی آیت مبارکہ میں تمام اہل ایمان کو تنبیہ کی جارہی ہے بتایا جارہا ہے کہ اگر انہیں موت آجائے اور ان کے پیچھے ان کے وارث ناتواں کمزور ہوں یا نادان بچے ہوں تو پھر ان کا کیا ہوگا' ذیل میں ہم آیت کا ترجمہ دے رہے ہیں۔

ترجمہ:۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کیسے اندیشے لاحق ہوتے۔ پس اللہ سے ڈر کر راستی کی بات کریں۔ (النساء۔۹)

اللہ تبارک وتعالیٰ اہل ایمان کو نصیحت فرما رہا ہے کہ اگر تم نے اپنی زندگی میں مساکین وغربا اور یتیموں کا خیال نہیں کیا تو کیا تم یہ سمجھتے ہو یا پسند کرو گے کہ خود تمہارے مرنے کے بعد تمہاری اولاد جو تمہارے مرتے وقت کمزور ناتواں یا کم عمر کی ہو وہ تمہارے ترکہ سے محروم رہ جائے۔ کوئی تمہارا ایسا رشتہ دار جو قوی ہو تمہارا ترکہ ہتھیا لے اور تمہاری اولاد بے میراث بے

یارومددگار رہ جائے کیا کوئی ایسا ہونا پسند کرے گا اس لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی زندگی میں بھی ایسا عمل کرو جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی کے معاملات چلائیں اور کسی کی کسی بھی طرح حق تلفی نہ کریں اور حق دار کے حق کو مقدم جانے اللہ تعالیٰ بڑا ہی مہربان اور رحیم وکریم ہے وہ اپنے تمام ہی بندوں سے بڑے کرم وفضل کا معاملہ کرتا ہے ہماری رہنمائی کے لیے ہی نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور کتاب الٰہی میں تمام احکام زندگی ومعاملات زندگی کھول کر بتادیئے تاکہ اسلام جو شائستگی اور تہذیب کا دین مبین ہے کہ ماننے والے کہیں پہلی امتوں کی مانند بھٹک نہ جائیں۔
وراثت کے معاملے کو بھی اللہ تعالیٰ نے خوب وضاحت سے قرآن حکیم میں بتادیا ہے جیسا کہ آنے والی آیت مبارکہ میں کہا ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

ترجمہ:۔ تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے اگر (میت کی وارث عرف) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔2/3 اور اگر میت صاحب والدین (میت کے والدین اگر زندہ ہوں) ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ (1/6) ملنا چاہئے۔ اور اگر میت صاحب اولاد نہ ہو (لاولد) اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے'

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ یہ تمام حصے اسی وقت نکالے جائیں گے جبکہ میت نے جو وصیت کی ہو پوری کردی جائے اور اگر اس پر جو کچھ قرض ہو وہ ادا کردیا جائے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں کون بہ لحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے تو اللہ تعالیٰ نے مقرر کردیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔ (النساء۔۱۱)

میراث کے معاملے میں یہ اولین اصول قرآن کریم کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نافذ فرمادیا کہ مرد کا حصہ عورت کے حصے سے دوگنا ہے۔ یعنی دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد تمام وارثوں کے حصوں کی تقسیم اور تقرری کا طریقہ بتایا جارہا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے حتمی ہدایت و وصیت ہے کہ تم اپنی اولاد کے لیے جو ترکہ چھوڑو گے اسے کس طرح تقسیم کرنا ہے۔ یہ علم میراث کا اصل الاصول ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ شفیق و مہربان ہے۔ وراثت کی تقسیم دراصل اللہ تعالیٰ کی وصیت ہے وہی تمام حصے مقرر کرتا اور تقسیم کرتا ہے جیسے وہ واجبات وفرائض مقرر کرتا ہے اور اس عظیم کائنات میں اپنی تمام مخلوقات کو روزی باہم پہنچاتا ہے۔ ایسے ہی وہ لوگوں میں ترکے تقسیم کرتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ایسی صورت حال کا ذکر بھی ہے کہ اگر مرنے والے کا کوئی بیٹا نہ ہو اور اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زیادہ تو ہر صورت میں کل ترکے کا 2/3 حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا اور باقی 1/3 حصہ دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ اور اگر میت کا صرف ایک لڑکا ہی ہو تو اس پر تمام فقہا کا اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ تمام مال کا وارث ہوگا اور اگر دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا باقی سب مال اسے ملے گا اور اگر اولاد میں صرف ایک لڑکی ہو تو

ترکہ کا نصف 1/2 سے ملے گا باقی دوسرے ورثا میں تقسیم ہوگا۔ یعنی مرنے والے کے باپ دادا' بھائی' چچا پھر باپ دادا کی اولاد۔ ورثے کی تقسیم اس ترتیب سے ہوگی پہلے وصیت پوری کی جائے گی اگر مقروض تھا تو قرض ادا کیا جائے گا۔ دوم والدین سوم اولاد چہارم بھائی بہن۔

میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں میت کے والدین میں سے ہر ایک 1/6 چھٹے حصے کا حق دار ہوگا خواہ میت کے وارث بیٹے بیٹیاں ہوں۔ باقی 2/3 ان سب وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اگر ماں باپ کے سوا مرنے والے کا کوئی اور وارث نہ ہو باقی کا 2/3 اس کے باپ کو ملے گا اور اگر دوسرے رشتہ دار موجود ہوں تو پھر اس 2/3 حصے میں مرنے والے کا باپ اور دیگر رشتہ دار وارث شریک ہوں گے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر میت کے والدین زندہ ہوں تو ایسی صورت میں مرنے والے کے بہن بھائی کو ترکہ نہیں ملے گا۔

مرنے والے کی وصیت کو بہت اہمیت دی گئی ہے اسے قرض پر مقدم رکھا گیا ہے ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کا مقروض ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ وصیت کرنا ہر ایک کے لیے بہت ضروری اور اہم ہے لیکن اگر مرنے والا مقروض تھا تو ترکہ میں سے سب سے پہلے اس کا قرض ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد وصیت کے مطابق عمل کیا جائے اور پھر وارثوں میں وراثت کی تقسیم ہوگی وصیت کے بارے میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۰ میں حکم دیا ہے کہ کتنے مال کی وصیت کی جاسکتی ہے۔ وصیت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے کل مال کے 1/3 یعنی تہائی حصے کی وصیت کا اختیار دیا ہے سارے مال کی وصیت کا اسے بھی اختیار نہیں۔ کیونکہ اسلام ایک بڑا مہذب اور شائستگی' انسانیت' اخوت کا مذہب ہے اسلام میں کسی بھی طرح حق تلفی کا حکم نہیں ہے اس لیے ہی وصیت کا قاعدہ بھی قانون وراثت میں مقرر کر دیا گیا ہے۔ وصیت کرنے والا اپنے ایسے عزیزوں کو جن کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملنے والا۔ مثلاً مرنے والے کے یتیم پوتا پوتی موجود ہوں یا کسی بیٹے کی بیوہ

موجود ہو اور مصیبت کے دن کاٹ رہی ہو یا کوئی بھائی بہن یا بھاوج بھتیجا بھانجا یا کوئی اور عزیز ایسا ہو جو سہارے کا محتاج ہو تو ایسے افراد کے حق میں وصیت کے ذریعے حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہو تو دوسرے مستحقین اور رفاہ عامہ کے کام کرنے والوں کے لیے بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔ یہ تمام وصیت کا عمل صرف کل مال ترکہ کا 1/3 سے زیادہ نہیں ہو گا شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو حق تلفی ظلم وزیادتی سے بچانے کے لیے تمام احکام میراث کو کھول کھول کر بیان فرما دیا ہے اگر کسی مرنے والے کی ایک بیوی ہو یا ایک سے زیادہ بیویاں ہوں اور اولاد بھی ہو تو اس صورت میں تمام یا اگر ایک ہے تو ایک ہی کو کل ترکہ کا 1/8 یعنی آٹھواں حصہ ملے گا اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو سب بیویوں میں ملنے والے 1/8 حصے کی برابر کی تقسیم ہو گی اور اگر مرنے والے کی اولاد نہ ہو تو ایسی صورت میں کل ترکے کا 1/4 حصہ بیوی یا بیویوں کو ملے گا جو سب میں برابر تقسیم ہو گا اگر مرنے والے کا کوئی وارث ہے تو باقی ترکہ اسے ملے گا اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو ایسی صورت میں مرنے والے کو یہ حق ہو گا کہ وہ باقی رہ جانے والے تمام ترکے کی وصیت کر سکے۔

اگر کہیں ایسی صورت حال ہو کہ مرنے والے کے ایسے بھائی بہن بھی ہوں جو صرف اس کے ماں جائے یعنی ان کی ماں اور مرنے والے کی ماں تو ایک ہی ہو لیکن باپ الگ الگ ہوں اگر ایک بھائی یا ایک ہی بہن ہو تو اس صورت میں بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے 1/3 میں وہ سب شریک ہوں گے جبکہ وصیت پوری کر دی گئی ہو اور قرض ادا کر دیا گیا ہو یہی اللہ کا حکم ہے اور یہ حدود اللہ ہے اگر ان قوانین کی کسی بھی طرح خلاف ورزی کی گئی تو خلاف ورزی کرنے والا اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا اور وہ اللہ کے باغیوں میں شمار ہو گا اس کے لیے رسوا کن سزا ہے اسے آگ میں

دیا جائے گا یہی حکم سوۃ النساء کی آیت ۱۳اور ۱۴ میں آیا ہے یہ آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے بڑی خوف دلانے والی ہیبت طاری کرنے والی ہیں۔ ان میں ایسے تمام لوگوں کو آگاہ کیا جارہا ہے جو اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانون وراثت کو اپنی مرضی ومنشاء سے تبدیل کرتے ہیں یا اس قانون وراثت کی مقرر کردہ حدود کو توڑتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں واضح طور پر مقرر کردی ہیں اس آیت میں سخت ترین سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔

اسلام نے وراثت کے جو قوانین اور قاعدے مقرر کیے ہیں وہ تمام دنیا کے مذاہب کے قواعد وراثت سے الگ اور منفرد ہیں اس میں کسی کی کسی بھی طرح نہ تو حق تلفی ہوتی ہے نہ کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کا امکان ہے۔ یہ قاعدے قانون بڑے ہی نازک اور دقیق اصولوں پر مبنی ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ سب کے سب قانون الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ جو ہمارے ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ مہربان اور شفیق ہے وہ کسی کے ساتھ نہ ظلم کرتا ہے نہ ہونے دیتا ہے یہ تو ہمارے اپنے بداعمال ہوتے ہیں جن سے ہمیں سزا یا سختی کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات بھی خصوصی توجہ چاہتی ہے کہ اگر مرنے والے نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی ہو تو گویا مرنے والے کی یہ معنوی ہدایت ہوگی کہ ورثا کو اس نسبت سے ترکہ دیا جائے جس نسبت سے احکام الٰہی میں موجود ہے ہاں اگر ان نے اپنے ترکہ کے لیے کوئی وصیت کی ہوتی تو پہلے اس پر عمل ہوتا۔ اسلامی تقسیم زر کا ایک عام اصول یہ ہے دولت کا بہت سے لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور کسی ایک شخص تک محدود ہونا غلط ہے۔ یہ بہترین اصول اکثر مذاہب اور قوموں نے نظر انداز کردیے ہیں اس وجہ سے ان کے قانون وراثت میں بڑی ناانصافی اور خلاف عمل احکام شامل ہوگئے ہیں جیسا کہ عیسائیوں میں صرف بڑے بیٹے کو جائداد ملتی ہے باقی بھائیوں کو کچھ نہیں ملتا اگر ملتا ہے تو معمولی حصہ۔ ایسے ہی ہندوؤں میں صرف اولاد ذکور کو یعنی صرف مرد یعنی بیٹے ترکے کے حق دار ہوتے ہیں بیٹیاں اور بیوی محروم رہتے ہیں اور

والدین کو بھی کچھ نہیں ملتا اور بہن بھائی کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ بلکہ اسلام نے انسان کے تمام رشتوں کا اور رشتہ داروں کا احترام کیا اور ان کے حق کی حفاظت کی ہے ہر ایک کا نا صرف حق مقرر کر دیا گیا اور اسے تاکید کے ساتھ ادا کرنے کا حکم بھی دیا اور احکام الٰہی کو نہ ماننے والوں کو سخت وعید و سزا بھی سنا دی کہ اگر وہ قانون وراثت پر حکم الٰہی کے مطابق اگر عمل نہیں کریں گے تو ان کا حشر کیا ہوگا۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے نزدیک قانون وراثت جو ایک نہایت اہم قانون ہے مرنے والے اور اس کے ورثا کے تعلق کی اہمیت وقعت کو مدنظر رکھتے ہوئے' جسے تین درجوں میں قرآن کریم نے مقرر کیا ہے۔ ذوی الفروض۔ عصبات۔ ذوالارحام۔ اور خاص کر ذوالارحام کا ذکر کئی آیتوں میں ملتا ہے۔ امام اعظمؒ نے ان تینوں مراتب کو اپنے فقہ میں قائم رکھا ہے کیونکہ یہ قرآنی نص سے ثابت ہے اس لیے ان میں کسی قسم کی کمی بیشی و ترمیم ممکن نہیں ہے لیکن امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے یہاں تیسرے درجے ذوی الارحام کو سرے سے ہی خارج کر دیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک مرنے والے کے نانا بھتیجے' بھانجے وغیرہ کسی طرح بھی وراثت نہیں پا سکتے۔ ان کے یہاں صرف ذوی الفروض اور عصبات ہی حق دار ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا استدلال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ بتایا ہے وہی شرعی اور جائز ہے اسی کو نافذ ہونا چاہیے۔

آئمہ اربعہ اور خصوصاً حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اجتہادی کوششیں اور فقہی معاملات دیگر مذاہب کے لوگوں پر بھی براہ راست اثر انداز ہو رہی ہیں گو کہ وہ زبان سے اپنی اسلام دشمنی کے باعث اقرار نہیں کرتے لیکن اسلامی اقدار و اصلاحات کو اپنا کر ان کا عملی اقرار کر رہے ہیں یعنی جو لوگ اسلام کے علاوہ دوسری شریعتوں کے پیروکار ہندو' عیسائی' یہودی اگر ہم انسانی زندگی کے چار اہم ترین مسائل پر تقابلی نظر ڈالیں تو انہیں اپنے مذہب کے

خلاف اسلامی اقدار کو ماننے والا پاتے ہیں۔(۱)وراثت(۲)طلاق وخلع (۳)تعداد ازواج(۴)نکاح بیوگان۔

(۱) وراثت سے متعلق ابھی تک وہ اصلاح نہیں ہوسکی جو اسلامی تعلیم کا مقصد ہے درحقیقت آج دنیا میں جس قدر انتشار سیاسی طور پر اقتصادی طور پر پایا جاتا ہے اس کی وجہ سرمائے کا چند ہاتھوں میں جمع ہونا ہے اگر دنیا کے دیگر مذاہب بھی اسلام کے قانون وراثت کو تسلیم کرلیں تو سرمایہ زیادہ عرصے تک کسی خاص شخص یا خاندان کے تصرف میں نہیں رہ سکے گا گو آج مسلمان بھی وراثت کے اسلامی قانون پر اس طرح اس قدر عمل نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے لیکن پھر بھی دیگر اقوام اور مذاہب سے بہتر ہیں۔آج ترقی پسند ہندو ملکی قانون کی مدد لے کر عورتوں کو وراثت میں حصہ دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ ان کے مذہب میں عورت کا مال و جائیداد میں کوئی حق نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو ملکی قانون میں اتنی وسعت و گہرائی نہیں ہے جیسی کہ اسلام کے قانون وراثت میں موجود ہے لیکن یہ کم بات نہیں کہ کسی بھی طرح کیسی ہی سوچ کے ساتھ اپنی ترقی پسندی کے نام پر ہی سہی اسلامی اقدار کی طرف قدم بڑھانے پر آمادہ تو ہو رہے ہیں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا یقیناً بہتر ہوتا ہے۔ایسے ہی یہودی اور عیسائیوں میں بھی عورت کو جائیداد میں بحیثیت وارث کوئی حصہ نہیں ہوتا عام حالات میں صرف اولاد نرینہ یعنی لڑکا وہ بھی پہلا بیٹا وارث حقیقی ہوتا ہے اور اگر اس کے اور بھائی ہوں تو انہیں پہلے کی نسبت آدھا حصہ ملتا ہے۔عیسائیت میں عورت کی وراثت کے بارے میں بالکل کچھ نہیں کہا گیا۔عورت کے حق وراثت کے بارے میں خاموش ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں یہودی مذہب کے مطابق وراثت تقسیم ہوتی ہے اب نئے اور موجودہ قانون وراثت کے مطابق امریکہ اور یورپ میں اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو اس کے تمام ترکے کی وارث صرف بیوی ہوتی ہے اور شوہر کی اولاد اور خود اس عورت کی اولاد ترکے سے

محروم رہ جاتی ہے اور اگر عورت مرجاتی ہے تو ایسے ہی تمام ترکہ اس کے شوہر کو مل جاتا ہے اس طرح اولاد کے حقوق بری طرح پامال ہوتے ہیں۔

(۲)۔ اسلام کے سوا کسی بھی مذہب میں تعداد ازواج پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ ہندو دھرم اور یہودیت میں تو تعداد ازدواج کی کوئی قید نہیں۔ ہندو کہنے کو تو ایک بیوی کے اصول کو مانتے نظر آتے ہیں ایسا ملکی قانون کے باعث نظر آتا ہے اس سے پہلے مذہبی طور پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی ان کی ویدوں میں ایسے مناظر کثرت سے موجود ہیں۔ یہودیوں نے بھی اسلامی قانون کے مطابق چار کی قید عائد کری ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی قانون ہے اس سے پہلے ان کے یہاں بھی بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

(۳)۔ بیسویں صدی سے قبل تک ہندو اور یہودیوں میں نیوگ کے نام سے ایک رسم رائج تھی (نیوگ کی رسم میں مرنے والے کی بیوہ سے مرنے والے کی اگر کوئی اولاد نہیں ہوتی بالخصوص بیٹا تو وہ عورت اپنے شوہر کی زندگی میں ہی شوہر کی اجازت و مرضی سے کسی دوسرے مرد سے مقاربت کے بعد اولاد پیدا کرتی تھی اور اگر عورت میں خرابی ہوتی تو مرد کسی دوسری عورت سے بغیر نکاح کے اولاد پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر کسی بیوہ ہونے والی عورت کی اولاد خصوصاً لڑکا نہیں ہوتا تھا تو وہ مرنے والے خاوند کے جانشین کو پیدا کرے اس کے لیے کسی قریبی رشتہ دار مرنے والے کے بھائی کی طرف رجوع کرتی تھی بغیر کسی نکاح کے اور قانونی بندھن کے نیوگ کے ذریعہ اولاد پیدا کرنے سے مرنے والے کی نجات و مغفرت ہوتی ہے) اس قانون نیوگ میں مرنے والے کی عورت بھی اس کے ترکے کا حصہ یعنی جائیداد وملکیت مانی جاتی تھی۔ کسی کے فوت ہو جانے پر اس کے ترکے کا وارث اگر اس کا بھائی یا کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار ہوتا تو دوسری املاک و جائیداد کی مانند اس کی بیوہ عورت بھی وارث کو مل جاتی تھی تمام مذاہب میں مرنے والے کا قریبی رشتہ دار اس کا بھائی ہی ہوتا تھا اس لیے نیوگ

کا سب سے پہلا حق دیور ہی کو دیا جاتا تھا۔ یہودیت میں بھی نیوگ کا پہلا حق دیور یعنی مرنے والے کے بھائی کا ہی ہے آریہ سماج میں نکاح بیوگان حرام ہے اور زنا کے مترادف ہے اس کی جگہ بیوہ عورت نیوگ کر سکتی تھی لیکن اب بیسوی صدی میں آریہ سماج بھی بیواؤں کے نکاح ثانی کی تبلیغ کر رہے ہیں اور بیوہ عورت کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے یہ اقدام یقیناً اسلامی اقدار سے متاثر ہونے کی نمایاں علامت ہے۔

(۴) ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں طلاق کا کوئی رواج ہی نہیں تھا عورت ایک بار کسی مرد سے نکاح کر لیتی تو مر کر ہی اس سے جان چھوٹتی تھی ایسا ہی یہودیت میں تھا لیکن آج ہندو عیسائی اور یہودی سب کے سب طلاق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی اجازت دیتے ہیں ہندوؤں نے بھی قانون کی مدد سے طلاق وخلع کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ عیسائیوں میں رومن کیتھولک مذہب طلاق کے خلاف تھا اس پر ان میں بغاوت پیدا ہوئی اور پروٹسٹنٹ فرقے نے جنم لیا اور طلاق کی اجازت دے دی جس سے بڑی عجیب اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی جس طرح سے یورپ اور امریکہ کی عدالتوں میں درخواستیں دی جاتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے نکاح کو کھیل بنالیا ہے اب خود عیسائی مشنریز نکاح طلاق کے قوانین میں اصلاح کے خواہش مند ہیں اور کوشش کر رہے ہیں اس لیے امید کی جا سکتی ہے کہ کچھ مدت گزرے گی کہ انہیں اسلامی قانون طلاق وخلع پر عمل پیرا ہونے میں ہی عافیت نظر آنے لگے گی۔ یہودیوں میں تو طلاق کا مسئلہ بالکل اسلامی طریقہ پر رائج ہو چکا ہے۔

اگرچہ ہندو عیسائی یہودی زبانی طور پر اسلام کی حقانیت اور اس کے قوانین کی اہمیت ومضبوطی کا اقرار تو نہیں کرتے لیکن اپنے عمل سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے مذہبی مسائل کا حل ان کے مذہب کی تحریف شدہ کتابوں میں نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ زمانے سے

مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کے مسائل کا حل بھی درحقیقت اسلام میں ہی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ جو وعدہ کیا کہ ''ہم پہلی شریعت یا وحی منسوخ نہیں کرتے یا اسے لوگوں کے دل سے فراموش یا محو نہیں کرتے جب تک اس کی جگہ اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسی دوسری شریعت نہیں لے آتے۔''

آئمہ اربعہ اور خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہؒ کا اسلامی فقہ کا کارنامہ اتنا اہم اور بڑا ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگوں پر اسلام کی اہمیت وقعت وقت کے ساتھ ساتھ ثابت ہو رہی ہے۔

آئندہ صفحات میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایسے واقعات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں پیش آئے اور جن کا فقہی حل انہوں نے فوری کی فوری پیش کر دیا اور لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

حضرت ابوحنیفہؒ کو پیش آنے والے واقعات اور ان کی فراست

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا کہ ایک شخص کے دو درہموں کے ساتھ دوسرے شخص کا ایک درہم مل گیا پھر ان میں سے دو درہم گم ہو گئے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کون سے ضائع ہوئے جو درہم باقی بچا ہے اس کی تقسیم کیسے ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا جو درہم باقی بچا ہے وہ اثلاث کے طریقہ پر تقسیم ہوگا یعنی جس کے دو درہم تھے اس کو دو حصے اور جس کا ایک درہم تھا اسے ایک حصہ ملے گا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں پھر ابن شبرمہؒ کے پاس گیا ان سے بھی یہی مسئلہ دریافت کیا انہوں نے پوچھا کیا یہ مسئلہ کسی اور سے بھی پوچھا ہے تو میں نے کہا ہاں ابوحنیفہؒ سے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ انہوں نے فرمایا ہوگا کہ درہم بطریق اثلاث تقسیم ہوگا۔ میں نے کہاں ہاں۔ وہ کہنے لگے کہ اللہ کے بندے نے غلطی کی پھر فرمایا جو درہم گم ہوئے ان میں سے ایک یقینی طور پر دو درہم والے کا تھا۔ دوسرا دونوں کا اور تیسرا بھی ان دونوں کے درمیان نصف ونصف تقسیم ہوگا۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے اس جواب کو پسند کیا۔ پھر میں امام ابوحنیفہؒ سے ملا تو امام صاحب نے مجھ سے پوچھا کیا تم ابن شبرمہؒ سے ملے تھے اور اس نے تمہیں درہم کی تقسیم نصف ونصف بتائی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا جب تین درہم آپس میں خلط ملط ہو گئے تو ان میں شراکت لازم ہوگی اور ایک درہم والے کے لیے ہر درہم میں ایک تہائی ہوگا اور دو درہم والے کا ہر درہم میں دو تہائی ہوگا۔ اس لیے جو درہم گم ہو گئے وہ دونوں کے اپنے اپنے حصے کے بہ قدر گم

ہوئے اور باقی جو رہا وہ بھی اپنے اپنے حصے کے بہ قدر رہا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا بھائی فوت ہوگیا ہے اس نے میراث میں چھ سو دینار چھوڑے ہیں لیکن مجھے صرف ایک دینار ملا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے عورت سے دریافت کیا کہ میراث کس نے تقسیم کی؟ اس نے کہا داؤد طائیؒ نے۔ اس پر آپ نے فرمایا تیرے لیے صرف اتنا ہی حصہ ہے۔

امام صاحب نے عورت سے پوچھا کیا تیرے بھائی نے دو بیٹیاں، ماں، بیوی اور بارہ بھائی اور ایک بہن اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ عورت نے کہا ہاں۔ اس پر آپؒ نے فرمایا کہ دو ثلث یعنی چار سو دینار دو بیٹیوں کے چھٹا حصہ یعنی سو دینار ماں کا اور ایک ثمن یعنی پچھتر دینار بیوی کے اور باقی بچ جانے والے پچیس دینار رہ گئے تو مرد کا چونکہ عورت سے دوگنا حصہ ہوتا ہے اس لیے بارہ بھائیوں کے چوبیس دینار ہر ایک کو دو دو دینار ملیں گے اور عورت کو ایک دینار جو تجھے ملا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک مرتبہ ایک سید کے بیٹے کے جنازے میں شریک تھے اس میں کوفے کے بڑے بڑے لوگ اور علماء (قاضی وغیرہ) بھی شریک تھے کہ لڑکے کی ماں شدت غم کے باعث ننگے سر اور کھلے چہرہ باہر نکل آئی اور اپنا دوپٹہ اپنے بیٹے کے جنازے پر ڈال دیا۔ جب لڑکے کے باپ اور اس عورت کے شوہر نے یہ دیکھا وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھ کر غصہ ہوا اور کہنے لگا اگر تو اسی جگہ سے نہ لوٹے تو تجھے طلاق یہ سن کر عورت کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے قسم کھائی کہ اگر میں نماز جنازہ سے پہلے لوٹوں تو میرے سارے غلام آزاد جنازہ ابھی راستے میں ہی تھا یہ سب سن کر لوگ رک گئے۔ اس شخص نے جس کے بیٹے کا جنازہ تھا امام ابوحنیفہؒ کو اپنی اور اپنی بیوی کی قسم کے بارے میں بتایا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے کہا کہ اپنی بات دوبارہ کہو جب اس نے دوبارہ اپنی بات دہرادی تو امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جنازے

کی نماز کے لیے یہیں صفیں درست کرلو اور جو لوگ آگے جا چکے ہیں انہیں یہیں بلالو پھر نماز جنازہ وہیں پڑھنے کا حکم دیا جب نماز جنازہ پڑھ لی گئی تو امام صاحبؒ نے عورت کو گھر لوٹ جانے کا حکم دیا اس طرح نہ اسے طلاق ہوئی اور نہ اس کے غلام ہی آزاد ہوئے کیونکہ عورت اپنے شوہر کی قسم کے مطابق اسی جگہ سے لوٹ گئی جبکہ عورت کی قسم بھی پوری ہوگئی۔ وہ نماز جنازہ کے بعد گئی امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا یہ فیصلہ دیکھ کر قاضی ابن شبرمہؒ چلا اٹھے۔ اے حنیفہؒ اب عورتیں تجھ جیسا بچہ جننے سے عاجز آ گئیں تیرے علم سے مسئلے نکالنے میں کوئی مشقت نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہؒ دیگر علمائے شہر کے ساتھ ایک ولیمہ میں شریک تھے جہاں دو بہنوں کا نکاح دو بھائیون کے ساتھ ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ صاحب خانہ چیختا چلاتا باہر آیا اور بتانے لگا کہ بڑی مصیبت پیدا ہوگئی۔ رات میں دونوں دلہنیں تبدیل ہوگئیں اور ان سے دونوں لڑکوں نے صحبت بھی کرلی۔ (یعنی اپنے بھائی کی بیوی سے ہم بستر ہوا) اس مجلس ولیمہ میں حضرت سفیانؒ بھی موجود تھے لوگوں نے ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ کوئی بات نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی معاملے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو فتویٰ میں فرمایا تھا کہ عورت پر صحبت (ہم بستری) کی وجہ سے مہر لازم ہوگیا اور ہر عورت اپنے شوہر کے پاس لوٹ جائے لوگوں نے ان کے جواب کو پسند کیا اس محفل میں حضرت مسعر بن کدامؒ بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے حضرت امام ابوحنیفہ سے فرمایا آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت سفیانؒ نے کہا یہ اس کے خلاف اور کیا کہیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ دونوں لڑکوں کو بلالاؤ جب دونوں لڑکے حاضر ہوگئے تو امام صاحبؒ نے ہی ایک سے پوچھا کہ جس لڑکی سے تو نے صحبت کی ہے وہ تجھے پسند ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر انہوں نے لڑکے سے پوچھا اس لڑکی کا کیا نام ہے جو تیرے بھائی کے پاس

ہے اس نے نام بتا دیا اس پر امام صاحبؒ نے فرمایا اس کا نام لے کر کہو کہ میں نے اسے طلاق دی۔ اس طرح دونوں بھائیوں نے اپنی منکوحہ لڑکی کو طلاق دے دی اس کے بعد امام صاحبؒ نے فرمایا اب تم نے جس لڑکی کے ساتھ رات بسر کی ہے اس سے نکاح کر لو۔ لوگوں نے اس جواب کو سفیانؒ کے جواب سے زیادہ پسند کیا اور فرط مسرت سے محدث مسعر بن کدامؒ نے اٹھ کر امام ابو حنیفہؒ کی پیشانی چوم لی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی ہے کہ میں تجھ سے اس وقت تک نہیں بولوں گا جب تک تو از خود مجھ سے نہ بولے۔ اس بات پر میری بیوی نے بھی قسم کھالی کہ میں تجھ سے اس وقت تک نہیں بولوں گی جب تک تو مجھ سے نہیں بولے گا۔ امام صاحب نے فرمایا تم دونوں میں سے کسی پر بھی کفارہ نہیں کیونکہ قسم نہیں ٹوٹی۔ جب امام صاحب کے اس فتویٰ کی خبر حضرت امام سفیان ثوریؒ کو ہوئی تو وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ پر ناراض ہوئے اور فرمایا تم غلط فتویٰ دیتے ہو اس پر کفارہ آئے گا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا حضرت جب اس کی بیوی نے اس شخص کی قسم اٹھانے کے بعد قسم اٹھائی تو اس طرح اس نے کلام تو کر لیا۔ (اپنے شوہر سے بات کر لی) جس سے اس کی قسم ختم ہو گئی اب اگر وہ اپنی بیوی سے بات چیت کرے گا تو اس پر کفارہ نہیں آئے گا اور نہ ہی وہ گناہ گار ہو گا کیونکہ عورت کا کلام کرنا قسم کے بعد تھا یوں قسم خود بہ خود ختم ہو گئی۔

ایک شخص حضرت امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوا کہ میں نے اپنی ایک امانت فلاں شخص کے پاس رکھوائی تھی لیکن اب وہ واپس کرنے سے منکر ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ آپ نے اسے تسلی دی اور فرمایا اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا پھر آپ نے اس شخص کو بلایا جس کے پاس امانت رکھی گئی تھی۔ آپؒ نے اس سے علیحدگی میں فرمایا کہ حکومت نے مجھ سے ایک آدمی طلب کیا ہے جس میں قاضی بننے کی صلاحیت ہو کیا تو اس کے لیے تیار ہے؟

وہ سوچنے لگا امام صاحبؒ نے اسے ترغیب دی وہ جب چلا گیا تو امام صاحبؒ نے امانت رکھوانے والے سے کہا تو اب جا کر اس سے کہہ کہ جناب شاید آپ بھول گئے ہوں میں نے آپ کے پاس اپنی امانت رکھوائی تھی جس کی یہ نشانی تھی۔ امانت رکھنے والے نے سوچا اگر میں اس کی امانت واپس نہیں کرتا تو خائن ثابت ہو جاؤں گا اور قاضی کا عہدہ مجھے نہیں مل سکے گا اس لیے اس نے فوراً ہی امانت لوٹا دی۔ اس کے بعد وہ شخص امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ امام صاحبؒ اسے قاضی بنوا دیں امام صاحبؒ نے اس سے کہا۔ ذرا صبر کر میں تجھے اس سے بھی بڑا عہدہ پر فائز کرادوں گا جب تک کوئی بڑا عہدہ خالی نہیں ہوتا میں تیرا نام نہیں لکھواؤں گا (اس تدبیر سے غریب کی امانت واپس مل گئی)

حضرت لیث بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ میں مکہ شریف میں تھا کہ ایک مجمع میں امام ابوحنیفہؒ سے ایک مال دار شخص نے سوال کیا کہ میں اپنے بیٹے کی شادی پر بڑا مال خرچ کرتا ہوں لیکن وہ طلاق دے دیتا ہے اور اگر باندی خرید کر دوں تو آزاد کر دیتا ہے میرا بڑا مال ضائع ہو جاتا ہے۔ مجھے کوئی تدبیر ایسی بتائیں کہ میرا مال ضائع نہ ہو۔ اس پر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اپنے بیٹے کو غلاموں کے بازار میں لے جاؤ اور جو باندی اسے پسند ہو خرید کر اس کا نکاح کر دو۔ اگر وہ اسے طلاق دے گا تو تیری باندی تیری پاس لوٹ آئے گی اور اگر آزاد کرے گا تو اس کی آزادی نافذ نہیں ہو گی کیونکہ وہ باندی اس کی ملکیت نہیں ہو گی۔

ایک بار خلیفہ منصور کے دربار میں امام ابوحنیفہؒ کے ایک دشمن نے امام صاحب سے خلیفہ کے سامنے ایک سوال پوچھا کہ امیر ہمیں حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کی گردن اڑا دو ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ فیصلہ حق ہے یا نہیں، کیا ہم بغیر تحقیق کے قتل کر دیا کریں؟ امام صاحبؒ نے سوال کرنے والے سے سوال کیا کہ ہمارا امیر فیصلہ صحیح کرتا ہے یا غلط؟ اس نے کہا امیر فیصلہ صحیح کرتا ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا صحیح فیصلہ نافذ ہونا چاہئے اس کے لیے تحقیق کی ضرورت

نہیں۔ وہ شخص چونکہ امام صاحب سے دشمنی رکھتا تھا اس لیے یہ سوال امام صاحبؒ کو پھنسانے کی غرض سے کیا تھا کیونکہ اس کی سمجھ کے مطابق اگر امام صاحبؒ یہ کہتے جائز ہے تو وہ کہتے کہ جائز نہیں دونوں طرح فیصلہ غلط ہوتا تو امیر غصہ ہو کر امام صاحبؒ کو قتل کروا دیتا۔ لیکن امام صاحبؒ کی فراست نے الٹا اسے ہی پھنسا دیا۔

ایک شیعہ (رافضی) امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ صحابہؓ میں کون سب سے بڑا بہادر تھا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا اہل سنت کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے بہادر تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔ اس لیے وہ اُن کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن تمہارے نزدیک (شیعوں کے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے بہادر تھے کیونکہ تم لوگ کہتے ہو کہ خلافت پر حضرت علی کرم اللہ وجہ کا حق تھا لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے جبراً چھین لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے خلافت نہ لے سکے یہ سن کر سوال کرنے والا شیعہ حیران رہ گیا۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ وہ شخص کیا کرے جس نے یہ قسم اٹھائی ہو کہ (اگر آج کے دن میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو طلاق، اور اگر آج میری کوئی نماز قضا ہو جائے تو تب بھی طلاق اور اگر آج دن میں اپنی بیوی سے رجوع نہ کروں (ہم بستری) تو بھی طلاق۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جب یہ مسئلہ سنا تو فرمایا پہلے کا حل نہایت آسان ہے وہ شخص عصر کی نماز پڑھ کر اپنی بیوی سے صحبت (ہم بستری) کرے پھر غروب آفتاب کے بعد غسل کر لے پھر مغرب کی نماز پڑھ لے کیونکہ آج دن سے پانچ نمازیں مراد ہے۔

ایک شخص نے امام اعظمؒ سے پوچھا کہ ایک شخص کی بیوی سیڑھی پر چڑھ رہی تھی اور سیڑھی کے درمیان پہنچ چکی تھی کہ اس کے شوہر نے اس سے کہا کہ اگر تو اوپر چڑھی تو طلاق

اور اگر نیچے اترے تو طلاق اب وہ عورت کیا کرے؟

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ چند افراد مل کر سیڑھی اٹھا کر زمین پر رکھ دیں یا پھر چند عورتیں زبردستی بغیر اس عورت کی مرضی کے اسے اٹھا کر نیچے لے آئیں۔

ایک عورت امام صاحب کے پاس آئی اور کہا کہ میرے شوہر نے کہا ہے کہ اگر میں نے ایسی ہانڈی نہیں پکائی جس میں ایک پاؤ نمک ڈالو لیکن اس نمک کا اثر کھانے میں ظاہر نہ ہو ورنہ تجھے طلاق۔ اس پر امام صاحبؒ نے فرمایا ہانڈی میں انڈے پکا اس میں ایک پاؤ یا اس سے بھی زیادہ نمک ڈال دے۔ اس طرح تیرے شوہر کی قسم بھی پوری ہو جائے گی اور تجھے طلاق بھی نہیں ہوگی۔

ایک بار امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کو قتل کرنے کی نیت سے دھریوں کا ایک گروہ آیا (جو اللہ کو نہیں مانتے آج کل ہم جنہیں دہریہ کہتے ہیں) امام صاحب سے کہنے لگے کہ تم مخلوق کے خالق کے قائل ہو۔ امام صاحبؒ نے فرمایا پہلے تو مناظرہ کرو پھر جو تمہارا ارادہ ہو کر لینا اس پر گروہ کے لوگوں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہ بتاؤ کہ ایک ایسی کشتی جو سامان سے خوب بھری ہو اور سمندر میں بھی طوفانی لہریں ابھر رہی ہوں کیا بغیر ملاح کے چل سکتی ہے۔ اس پر گروہ کے لوگوں نے کہا نہیں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ان کی بات سن کر حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دنیا جس میں تبدیلی اور اس کے احوال کو بدلنا اور اس کے تمام امور کا تغیر وغیرہ سب کسی ہستی اور مدبر کے بغیر ہی چل رہے ہیں۔ امام صاحبؒ کی بات سن کر دھریوں کے گروہ نے اپنی تلواریں اپنی نیام میں ڈال لیں اور توبہ کر لی۔

ایک شخص نے دوسرے ایک شخص کو ایک ہزار دینار کی تھیلی دے کر اسے وصیت کی کہ جب میرا بیٹا بڑا ہو جائے تو جو تجھے پسند ہو اتنا اس کو دے دینا۔ جب لڑکا بڑا ہوا تو اس شخص

نے ہزار دینار خود رکھ کر خالی تھیلی لڑکے کو دے دی۔ لڑکا امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا سنایا۔ امام صاحبؒ نے اس شخص کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس لڑکے کو ہزار دینار دے دو کیونکہ جو انسان کو پسند ہوتا ہے وہی وہ رکھتا ہے اور جو ناپسند ہوتا ہے دے دیتا ہے۔ چونکہ تجھے یہ دینار پسند ہیں جو تو نے روک لیے جبکہ وصیت یہ ہے کہ جو تجھے پسند ہو وہ اس لڑکے کو دینا۔ اس پر اس شخص نے ہزار دینار لڑکے کو ادا کر دیئے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے کارنامے اور قیاس اور رائے کے فیصلے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ کتاب کا موضوع حضرت امام اعظمؒ کی شخصیت کے بارے میں حنفی مسلک کے مقلدین یعنی ماننے والے پیروکاروں کو حضرت امام اعظمؒ کے مثبت پہلوؤں اور فقہی معلومات کو اجاگر کرنا ہے تاکہ نئی نسل یہ جان سکے کہ حضرت امام اعظم جن کا شہرہ چاروں وانگِ عالم میں ہے وہ کون تھے اور کیوں اتنے مشہور اور معتبر ٹھہرے۔ اپنے مقصد میں کتنا کامیاب رہا یہ تو آپ کو کتاب پڑھنے سے اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کتاب میں صرف حضرت امام صاحبؒ کے دو پہلوؤں پر ہی اکتفا کیا ہے پہلا امام صاحب کی معیشت اور ذرائع و مصادر دوسرا امام صاحبؒ کی حیات عامہ کا موقف۔ حضرت امام صاحبؒ چالیس سال کی عمر میں مسند تدریس پر متمکن ہوئے جب ان کے استاد حضرت حمادؒ وصال فرما گئے اگر دیکھا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی اس طرح حکم الٰہی سے پوری ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مسند نبوت چالیس سال کی عمر میں عطا ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ عمر تمام تر پختگی کی ہوتی ہے۔ انسان ہر قسم کے واقعات و حادثات سے گزر کر تجربہ حاصل کر چکا ہوتا ہے اور معاملات حیات کے مسائل سے پوری طرح آگاہی حاصل کر چکا ہوتا ہے اور تمام متعلقین کا اعتماد یقین اس پر قائم ہو چکا ہوتا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کر چکے ہوتے ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ نے جب اپنے استاد شیخ حمادؒ کی مسند سنبھالی اور اپنے شاگردوں کو درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اس کے

باوجود انہوں نے اپنا آبائی پیشہ تجارت جو انہیں ورثے میں ملی تھی کو بھی جاری رکھا اور فقہ و دین کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ امام صاحبؒ بحیثیت تاجر بھی بڑے دیانت دار اور معاملہ فہم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت میں استغنا اور حرص و طمع سے نفرت تھی وہ بے انتہا امانت دار اور دیانت دار تھے۔ طبیعت میں بخل بالکل نہیں تھا اور بڑے ہی زاہد پرہیز گار متقی عبادت گزار تھے۔ تجارتی معاملات میں انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وہ اپنے وقت کے عظیم الشان تاجر تھے۔ بڑے ہی سخی اور سیرت و کردار عقل و وفا پرستی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ امام صاحبؒ اپنے تجارتی نفع سے علماء کے وقار و ضروریات کا پورا خیال کرتے تھے تاکہ وہ حصول اور تحصیل علم کے سلسلے میں ہر قسم کی بخشش و عطا سے بے نیاز رہیں۔

امام صاحبؒ نے امویوں اور عباسی دونوں حکومتوں کا زمانہ پایا تھا اموی دور حکومت میں تقریباً باون سال اور عباسی دور حکومت میں اٹھارہ سال گزارے۔ دونوں حکمرانوں کا رعب دبدبہ و طنطنہ بھی دیکھا اور ان کا زوال و انحطاط بھی۔ انہوں نے عباسیوں کا وہ دور بھی دیکھا تھا جب ان کی تحریک زیرزمین ایران میں پھیل رہی تھی اور یہ بھی دیکھا کہ کس طرح عباسیوں نے امویوں پر غلبہ حاصل کر کے اقتدار چھین لیا۔

بنو امیہ کے دور میں یزید بن عمر ابن ہبیرہ نے جو اس وقت کوفہ کا گورنر تھا تمام فقہا کو طلب کیا تاکہ عراق جو ہر قسم کے فتنوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا اس کی اصلاح کر سکے۔ ان فقہا میں حضرت ابن ابی لیلیٰؒ، حضرت ابن شبرمہؒ حضرت داؤد بن ہندؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ شامل تھے۔ گورنر کوفہ ابن ہبیرہ نے سب کو اپنے دربار میں منصب عطا کئے اور حضرت امام ابوحنیفہ کو سرکاری مہر دے کر قاضی کے عہدہ دینا چاہا تاکہ جو کوئی حکم نافذ ہو اور خزانے سے کوئی مال برآمد ہو وہ سب امام صاحبؒ کی نگرانی میں ہو اور ان کے ہاتھ کے نیچے سے نکلے۔ مگر امام

صاحبؒ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر گورنر ابن ہبیرہ نے قسم کھائی کہ اگر وہ عہدہ قبول نہیں کریں گے تو انہیں تازیانوں کی سزا دی جائے گی سب فقہا جو وہاں موجود تھے نے انہیں سمجھانے کی بڑی کوشش کی انہوں نے کہا کہ آپؒ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ ہم آپ کے بھائی ہیں ہم بھی حکومت سے تعلق کو پسند نہیں کرتے اس وقت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اس پر امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ نے جواب دیا کہ اگر یہ شخص یہ چاہے کہ میں اس کے لیے شہر کی مسجد کے دروازے گنا کروں تو وہ بھی میں نہیں کروں پھر یہ پیشکش کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ وہ کسی کی گردن زدنی کا حکم دے گا اور میں فرمان تحریر کر کے اس پر مہر لگا دوں گا۔ یہ مجھے قطعی منظور نہیں۔

گورنر کوفہ ابن ہبیرہ کے حکم پر پولیس آفیسر نے امام صاحبؒ کو نظر بند کر دیا اور متواتر کئی روز تک انہیں کوڑے مارتا رہا آخر ایک روز امام صاحب پر کوڑے برسانے والا گورنر ابن ہبیرہ کے پاس آیا اور کہا کہ وہ شخص تو مرنے کو ہے اس پر گورنر نے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ ہماری قسم پوری کرے کوڑے مارنے والے نے امام صاحب کو جا کر یہ پیغام دیا تو جواب میں وہی بات امام ابو حنیفہؒ نے کہی جو وہ پہلے بھی کہہ چکے تھے۔ اس شخص نے ابن ہبیرہ کو جا کر پھر بتایا کہ امام صاحب نہیں مانتے اس پر اس نے کہا کہ کوئی شخص ہے جو انہیں سمجھائے کہ مجھ سے مہلت مانگ لیں تاکہ میں مہلت دے دوں۔

حضرت امام صاحبؒ کو جب یہ پیغام ملا تو انہوں نے فرمایا اچھا مجھے موقع دیا جائے میں اپنے احباب سے مشورہ کر لوں اور اس پر غور کر لوں۔ جب ابن ہبیرہ گورنر کوفہ کو یہ پیغام ملا تو اس نے فوراً ہی حضرت امام صاحبؒ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ امام صاحب رہائی کے بعد مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے اور مکہ میں اس وقت تک قیام فرمایا جب تک عباسیوں نے حکومت پر قبضہ نہیں کر لیا۔ حضرت امام اعظمؒ ابو جعفر المنصور کے زمانے میں کوفہ واپس تشریف

لیا ہے۔ (مناقب ابی حنیفہؒ المکی) امام صاحب نے تقریباً چھ سال کا عرصہ مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور اس قیام مکہ میں آپ نے اپنا زیادہ وقت حرم شریف میں گزارا۔

خلیفہ ابو جعفر منصور جو امام اعظم ابوحنیفہؒ کی مقبولیت اور شہرت اور ہر طبقہ فکر میں انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھا جانا پسند نہیں کرتا تھا پھر امام صاحب کے مخالفین نے بھی اس کے کان بھرے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیم بن عبداللہ جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھا جس نے بصرہ میں خلیفہ منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا کی زر کثیر سے اس کی مدد کی ہے۔ خلیفہ منصور اس وجہ سے بھی امام صاحبؒ کو قتل کرانا چاہتا تھا لیکن ان کی شہرت نیک نامی اور مقبولیت کے باعث وہ براہ راست ایسا نہ کر سکا اس نے امام صاحبؒ کو کوفہ سے اپنے پاس بلوایا اسے یہ بھی یقین دلایا گیا تھا کہ وہ قاضی بننے کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیں گے۔ جیسا کہ وہ یزید بن عمر ابن ہبیرہ کے دور میں کر چکے تھے اور کوڑوں کی سزا بھی برداشت کی تھی۔ اس لیے ہی خلیفہ منصور نے بھی وہی حربہ آزمایا اور امام صاحب کو قاضی بننے کی پیشکش کی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ اس پر انہیں قید کر دیا گیا۔ خلیفہ ہر روز انہیں آمادہ کرنے کے لیے پیغام بھیجتا رہا اور امام صاحبؒ کے انکار کے جواب میں ہر روز سختی میں اضافہ کرتا رہا روزانہ امام اعظمؒ کو جیل سے باہر لایا جاتا دس کوڑے مارے جاتے اور اعلان کے ساتھ آپ کو خون میں لت پت حالت میں شہر میں گھمایا جاتا۔ دس دن تک یہ انسانیت سوز اور ظالمانہ عمل ہوتا رہا اور آخر ایک روز سجدے کی حالت میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے اور اپنے خالق و مالک سے جا ملے۔

ابو محمد حارثیؒ نے محمد بن مہاجرؒ سے روایت کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے ایک پیالہ پیش کیا گیا اور کہا کہ وہ اسے پی لیں آپؒ نے انکار کر دیا کئی بار کہنے کے باوجود آپؒ نے وہ پیالہ نہیں پیا' آخر میں فرمایا میں اپنے قتل میں مدد نہیں کروں گا۔ آخر میں امام صاحبؒ کو زمین پر زبردستی گرا کر ان کے حلق میں زہر انڈیل دیا گیا جس سے ان کی وفات ہوئی۔

نعیم بن یحییٰ سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا وصال سفر کی حالت میں زہر پلانے سے ہوا۔

قاضی ابوعبداللہ صیمری نے فضل بن رکن سے روایت کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو زہر پلایا گیا تھا جس سے ان کی وفات ہوئی۔

قاضی ابوعبداللہ صیمری نے یعقوب بن شبیہ سے روایت کی ہے کہ امام صاحبؒ وصال کے وقت سجدے میں تھے۔

حافظ ابوالحسن محمد بن حسین شافعیؒ آبری اور موفق بن احمد نے ابوحسان زیادی سے روایت کی ہے کہ امام صاحبؒ کو جب موت کا احساس ہوا تو وہ سجدے میں گر گئے اسی حالت میں ان کا انتقال ہوا۔

حوالہ جات کتب

(۱) الخیرات الحسان۔علامہ ابن حجر مکیؒ۔ترجمہ مولانا عبدالغنی طارق

(۲) تبییض الصحیفہ۔علامہ جلال الدین سیوطیؒ ترجمہ مولانا عبدالغنی طارق

(۳) سیرۃ النعمان کامل۔شمس العلما حضرت مولانا شبلی نعمانیؒ

(۴) امام ابوحنیفہ۔عہد وحیات، فقہ وآرا۔استاد محمد ابوزہرہ مصری ترجمہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

(۵) تذکرہ نعمان۔علامہ محمد بن یوسف۔ترجمہ۔مولانا محمد عبداللہ مہاجر مدنی

(۶) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔از علامہ سید مناظر احسن گیلانی

(۷) اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔از سید قاسم محمود

(۸) فلسفہ التشریع فی الاسلام۔از ڈاکٹر صبحی محمصانی ترجمہ۔مولوی محمد احمد رضوی فلسفہ شریعت اسلام

(۹) معارف القرآن۔حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ

(۱۰) توضیح المسائل۔از آقائے سید علی حسینی سیستانی

(۱۱) اصول کافی

آیات قرآنی کی روشنی میں سلام کی اہمیت و تشریح
اہل ایمان کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کا انمول تحفہ خاص
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے کوزے میں دعاؤں کا سمندر عطا کر دیا ہے
مختصر مگر جامع دُعا
شائع ہو گئی
السلام علیکم
ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مولانا سعید احمد جلال پوری: مشتاق احمد قریشی نے سلام کی اہمیت کو عام فہم انداز میں مرتب کیا ہے
مفتی خالد محمود: یہ اپنے موضوع پر ایک اچھوتی اور منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے
حافظ عبد القیوم نعمانی: یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت ہے
مؤلف
مُشتاق احمد قریشی
ناشر
نئے اُفق گروپ آف پبلیکیشنز، احمد چیمبر، ڈاکٹر ملوریا اسٹریٹ آئی آئی چندیگر روڈ، کراچی